Registered No. L. 3840

جلد ۴۸
عدد ۳

ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ :

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۱۰۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۰/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ	
سلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-	لائحہ عمل	(زیر طبع)
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴	دین حق	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	/۳/
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	/۱۲/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت' بناؤ بگاڑ فی	-/۶/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
سلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

فہرست مضامین

جلد ۲۸	ربیع الاول ۱۳۶۵ھ مطابق فروری ۱۹۴۶ء	عدد ۳

اشارات	جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی	۲
تفہیم القرآن	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۳
مقالات		
موجودہ انتخابات اور جماعت اسلامی	جناب محمد عنایت اللہ صاحب وارثی	۳۳
جواب	ابوالاعلیٰ مودودی	۳۸
رسائل و مسائل		
بندوق کے شکار کی حلت و حرمت	ابوالاعلیٰ مودودی	۵۲
تحقیق حدیث دجال	"	۵۸
رد شبہات	"	۶۰
اعلان اجتماع	قیم جماعت اسلامی	۶۴

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، چمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام
پٹھان کوٹ (پنجاب) سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج ہم اس مسئلہ پر بحث کریں گے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام، اپنے مقصد کی تبلیغ کے لیے پہلے کن لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں اور کس طرح مخاطب کرتے ہیں؟ سوال کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو انبیا کی بعثت اُن کی پوری قوم کی طرف ہوتی ہے لیکن کیا وہ آغاز کار ہی میں پوری قوم کو مخاطب کرتے ہیں، یا شروع شروع میں ان کا تخاطب۔ قوم کے کسی خاص طبقہ سے ہوتا ہے؟ اگر کسی طبقہ سے ہوتا ہے تو وہ کون ہے؟ عامۃ الناس کا یا ان لوگوں کا جو عامۃ الناس کی قیادت و رہنمائی کرتے ہیں؟ سوال کے دوسرے جزو کا منشا یہ ہے کہ ایک واقعہ ہے کہ ہر نبی کی قوم، شروع شروع میں، اس کی دعوت سے بیگانہ بلکہ اس کی مخالف ہوتی ہے۔ پھر کیا وہ سب کو منکر و کافر فرض کر کے اپنی دعوت کا آغاز "اے کافرو! ایمان لاؤ!"، "اے مشرکو! اللہ کو ایک مانو!" سے کرتے ہیں یا ان کا طرز خطاب کچھ اور ہوتا ہے؟ یہ دونوں سوال نہایت اہم ہیں۔ ان کو ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے دعوت کے نقطۂ آغاز کو متعین کرنے میں بھی غلطیاں کی ہیں اور اپنا اور دوسروں کا صحیح پوزیشن سمجھنے میں بھی وہ افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یا تو یہ ہوا کہ ساری دعوت ایک غلط نقطہ سے شروع ہونے کی وجہ سے بے اثر رہی یا داعی یا دعوت کا صحیح موقف متعین نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک فتنہ کی شکل اختیار کر لی اور اصلاح کے بجائے اسی جڑ سے ایک نیا فساد اٹھ کھڑا ہوا۔

سوال کے پہلے حصہ کا جواب، اس تاریخ کی روشنی میں جو قرآن نے پیش کی ہے، ہمارے نزدیک یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سب سے پہلے قوم کے ارباب اثر کو مخاطب کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اُس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا۔ پھر اس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار

کی باگ تھی اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے بیٹھا تھا (اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰہٖمَ فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ ۔ بقرہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں۔ (اِذۡہَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّہٗ طَغٰی فَقُلۡ ہَلۡ لَّکَ اِلٰۤی اَنۡ تَزَکّٰی وَ اَہۡدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ فَتَخۡشٰی) حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہ اعظم بخت نصر کو دعوت دی۔ یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی۔ اسی طرح نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام، لوط علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، سب کی دعوتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے ارباب اقتدار اور مستکبرین کو جھنجھوڑا اور ان کے افکار و نظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ وہ لوگ تھے جو عرب کی مذہبی حکومت کے ارباب حل وعقد تھے اور اس کے واسطہ سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا کو دعوت دینے کے لیے آپ نے "امت وسط" کو جو طریقہ بتایا وہ بھی یہ تھا کہ آپ نے متعدد سلاطین عالم کو نامے لکھے اور اسلام کو پہلے ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ "اسلام لاؤ سلامت رہو گے ورنہ تمہاری اور تمہارے زیردستوں دونوں کی گمراہی کی ذمہ داری تم پر آئے گی"۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ بعد میں امت کے ارباب حل وعقد دعوت عام کے باب میں، اسی طریقہ کی پیروی کریں۔ اور خلافت راشدہ کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی طریقہ پر تبلیغ عام کی وہ ذمہ داری ادا کی جو ان پر شہداء اللہ علی الناس کی حیثیت سے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔

یہ ایک امر واقعہ ہے جس سے کوئی شخص، جس نے انبیاء کی تاریخ پڑھی ہو، انکار نہیں کر سکتا لیکن ساتھ ہی اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن کے بام و در پر آفتاب ہدایت کی کرنیں سب سے پہلے چمکتی ہیں تقدیر کی نیرنگی سے، قبول ہدایت میں سب سے پیچھے وہی رہتے ہیں۔ حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ، مدینہ کے کسان دور دور سے آتے ہیں اور داخل اسلام ہو جاتے ہیں لیکن قریش کے

اعیان و اکابر، ابولہب، ابوجہل، امیہ بن صلت، اور مکہ و طائف کے اشراف، جن میں سے ایک ایک کے سامنے خدا کا رسول شب و روز دعوت حق بلند کرتا ہے، اس برکت سے محروم رہتے ہیں۔ ان میں سے اگر فیض پاتے بھی ہیں تو وہ لوگ جن کی طرف دعوت کا خطاب براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ ترتیب دعوت میں پیچھے ہوتے ہیں وہی لوگ قبول دعوت میں آگے ہو جاتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کی بات پوری ہو کے رہتی ہے کہ "کتنے ہیں جو آگے ہیں، وہ پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے ہیں جو پیچھے ہیں وہ آگے ہو جائیں گے" ——— لیکن اس واقعہ کے باوجود حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنی دعوت کی ترتیب نہیں بدلتے اور عامۃ الناس کو اس وقت تک براہ راست مخاطب نہیں کرتے جب تک وقت کے کارفرما عناصر اور اکابر و اعیان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ان کو مایوس نہ کر دیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی بعثت کے شروع میں برابر علمائے یہود کے جمود پر ضربیں لگاتے رہے لیکن جب ایک عرصہ کی جد و جہد کے بعد بھی ان کے کبر و غرور اور پندار سیادت کی چٹان نہ ٹوٹی تو وہ ان کو چھوڑ کر جھیل کے کنارے کے ماہی گیروں کے پاس گئے اور ان کو دعوت دی کہ "اے مچھلیوں کے پکڑنے والو آؤ، میں تمھیں آدمیوں کا پکڑنے والا بنا دوں" اور اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے ان کو ایسے اہل ایمان دیے جو ان کے حواری کہلائے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۸۲-آل عمران)

جب عیسیٰ نے ان کی (علمائے یہود کی) طرف سے کفر پر اصرار کو بھانپ لیا (اور عام لوگوں کو مخاطب کر کے) کہا کون اللہ کی طرف بڑھنے میں میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہیے کہ ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔

اس آیت میں ان کی اسی دعوت عام کا ذکر ہے جو انھوں نے علمائے وقت کی کفر و ہٹ دھرمی واضح ہو جانے اور ان کے قبول حق سے مایوس ہو جانے کے بعد عام لوگوں کے سامنے نہایت درد اور دل سوزی کے ساتھ پیش کی ہے، اور شاید اسی دل سوزی کا، جو لفظ لفظ سے ٹپک رہی ہے، یہ اثر

تھا کہ جس دعوت حق سے یروشلم کے پشتنی دیندار رنجیدے اس نے دریا کے کنارے کے ملاحوں کے دلوں کو موم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے دعوت حق کے وہ خادم پیدا کیے جو بالآخر غالب اور فتحمند رہے۔ اسی بات کا ذکر سورہ صف میں بھی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ

اے ایمان والو، اللہ کے مددگار بنو جس طرح کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے تو حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار بنتے ہیں تو ایک گروہ بنی اسرائیل میں سے ایمان لایا (حواریوں کا گروہ) اور ایک گروہ نے کفر کیا (علماء و سادات کے گروہ نے) پس ہم نے مدد کی ان لوگوں کی جو ایمان لائے ان لوگوں کے خلاف جو ان کے دشمن تھے پس وہ لوگ غالب ہو گئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے ہدایت و ضلالت کے باب میں تقدیر کی اس نیرنگی پر نہایت موثر اور بصیرت افروز مثلیں بھی کہی ہیں لیکن بحث بالکل دوسرے گوشہ میں نکل جائے گی اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یہاں صرف اس حقیقت کو ہم سامنے لانا چاہتے ہیں کہ باوجودیکہ قبول دعوت میں سبقت وہی لوگ کرتے ہیں جو ترتیب دعوت میں موخر ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود حضرات انبیائے کرام جب تک وقت کے ذہین اور کارفرما عناصر سے مایوس نہیں ہو جاتے اس وقت تک عامۃ الناس کو براہ راست مخاطب نہیں کرتے۔

بعینہٖ یہی صورت حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی پیش آئی۔ آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق قریش کو دعوت دی جو سارے عرب کے دینی و سیاسی پیشوا تھے۔ اور ان کے سرداروں میں سے ایک ایک کے سامنے اللہ کے دین کو پیش کیا۔ جب ان کی طرف سے نفرت اور مخالفت کا مظاہرہ ہوا تو ان کے قبول اسلام کے لیے آپ نے دعائیں بھی کیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعضوں کے نام لے کر بھی آپ نے

دعائیں کیں۔ مثلاً منقول ہے کہ آپ نے دعا فرمائی کہ "اے اللہ عمر یا ابو جہل کے اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت دے"۔ ان لوگوں کے قبول اسلام کا شوق آپ پر اس قدر غالب تھا کہ اس جوش میں نہ آپ کو اپنے ضروری آرام کا خیال تھا، نہ اپنے مرتبہ اور عظمت کا۔ بلکہ بسا اوقات یہ ذوق و شوق آپ پر اس قدر حاوی ہو جاتا کہ ان مسلمانوں کی تربیت سے بھی غفلت ہو جاتی جو نعمت اسلام سے بہرہ ور ہو چکے ہوتے۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود آپ انہی لوگوں کے ساتھ مشغول رہے اور ان کے ہر قسم کے طعن و طنز، تحقیر و استہزاء اور عناد و اختلاف کو برداشت کرتے رہے۔ لیکن اس چیز کی ایک حد تھی جس کے بعد ان لوگوں کو زیادہ اہمیت دینا اور ان کے پیچھے پڑنا خود دعوت کے وقار کے خلاف تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس حد پر پہنچنے کے بعد آپ کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا اور صرف ان لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا جو ایمان لا چکے تھے یا جن سے توقع تھی کہ اگر ان کو کوئی نصیحت کی جائے تو، چونکہ وہ اس طرح کی بیماریوں سے محفوظ ہیں جن میں اقتدار و اثر رکھنے والے لوگ عموماً مبتلا ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ اس کو قبول کریں گے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر آپ کو متکبرین سے اعراض کا حکم دیا گیا

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُومٍ وَذَكِّرْ
فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (۵۴-۵۵ ذاریات)

پس ان (متکبرین) سے اعراض کرو اب تم کو کوئی ملامت نہیں ہے (کیونکہ تم نے اپنا حق ادا کر دیا) اور نصیحت کرو (ان لوگوں کو جو داخل اسلام ہو چکے ہیں) کیونکہ نصیحت اہل ایمان کو نفع پہنچاتی ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ
وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ
الذِّكْرَىٰ ۔ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّىٰ
وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ
يَسْعَىٰ وَهُوَ يَخْشَىٰ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ كَلَّا إِنَّهَا
تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ فِي صُحُفٍ مَرْفُوعَةٍ
مُطَهَّرَةٍ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ (عبس)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس بات کے سبب کہ اس کے پاس نابینا آیا اور تمھیں کیا خبر کہ شاید وہ پاکی حاصل کرے یا یاد دہانی حاصل کرے تو یاد دہانی اسے نفع پہنچائے۔ لیکن وہ جو بے پروائی کرتا ہے اس کے تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ اگر وہ پاکی نہ حاصل کرے تو تم پر اس کا الزام نہیں ہے۔ اور وہ جو تمہارے پاس ذوق و شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے اس سے تم غفلت برتتے ہو ہرگز نہیں (ان متکبرین کی اس قدر پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے) یہ تو ایک یاد دہانی ہے سو جس کا جی چاہے اس کو حاصل کرے، بلند اور پاک صحیفوں میں، گرامی قدر اور باوفا منشیوں کے ہاتھ میں۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (۸۸ الحجر)

اور ان کفار کی بعض جماعتوں کو جس مال و متاع سے ہم نے بہرہ ور کر رکھا ہے اس کی طرف نظر نہ اٹھاؤ اور ان کی بدبختی پر غم نہ کرو اور اپنا دامن شفقت اہل ایمان پر ڈالو۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا اپنی دعوت میں یہ ترتیب اختیار کرنا محض ایک اتفاقی واقعہ نہیں ہے اس کے نہایت اہم وجوہ ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

۱۔ اس کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ واضح وجہ تو یہ ہے کہ عوام الناس علم و عمل اور اخلاق و کردار میں ان لوگوں کے تابع ہوتے ہیں جو سوسائٹی میں اثر و اقتدار رکھتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکہم۔ لوگ ارباب اقتدار کے دین پر چلتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر ارباب اقتدار اصلاح قبول کرلیں تو عوام الناس خود بخود ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ اور اگر یہ بگڑے رہیں تو عوام الناس اولاً تو کوئی اصلاح قبول نہیں کرتے اور اگر قبول کرتے بھی ہیں تو اس کا اثر بہت جلد اڑ جاتا ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیائے کرام امتیاز رکھنے والے طبقات (PriviLEGED CLaSSES) کے خلاف کسی سیاسی یا معاشی تعصب میں مبتلا نہیں ہوتے اور نہ گرے ہوئے طبقات کے لیے ان کے دلوں میں کوئی بیجا عصبیت ہوتی کہ وہ طبقاتی جنگ برپا کرکے مقدم الذکر کو پست اور موخر الذکر کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ وہ جو مشن دنیا میں لے کر آتے ہیں وہ ایک فساد کو دوسرے فساد سے بدل دینے سے پورا نہیں ہوتا بلکہ پوری سوسائٹی کو خدا پرستی، اصلہ رحم اور خوف آخرت کی اساس پر قائم کرنے سے پورا ہوتا ہے اس وجہ سے عوام ہوں یا خواص وہ دونوں کو یکساں محبت و ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دونوں طبقے بیماریوں سے پاک ہوکر صحت قبول کرلیں۔ البتہ علاج میں وہ اونچے طبقات کو اس وجہ سے مقدم رکھتے ہیں کہ درحقیقت انہی کی بیماریاں ہوتی ہیں جن کی چھوت سے دوسرے بیمار ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ ان کے علاج کی فکر پہلے کرتے ہیں تاکہ دوسروں کے علاج میں زیادہ زحمت نہ ہو۔ اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کا طریقہ ہے جو اونچے طبقات کے خلاف ایک معاشی تعصب یا انتقام کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عوام

کو ورغلا کر اپنا کام چلاتے ہیں جس کی بہترین مثالیں جمہوری اور اشتراکی انقلابات کی تاریخ میں موجود ہیں۔ یہ طریقہ طالبین دنیا کا ہے۔ اس کی بنیاد قطع رحم پر ہے۔ اس میں اصل محرک اصلاح کی جگہ انتقام کا جذبہ ہوتا ہے اس کا ہتھیار طبقاتی جنگ ہے۔ اور اس کا ثمرہ صرف یہ ہے کہ ایک فساد کی جگہ دوسرا فساد برپا ہو جائے۔ اس لیے حضرات انبیائے کرام اور صالحین نے اس طریقہ کو کبھی اختیار نہ فرمایا۔ یہ ان کے شایان شان تھا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جو طبقہ قوم میں اونچا ہوتا ہے عموماً ذہنی اعتبار سے وہی برتر ہوتا ہے۔ یہ ذہنی برتری ہی ان کو قیادت کی جگہ دلاتی ہے۔ اس وجہ سے کوئی دعوت جس کا مقصد ایک اہم فکری و عملی انقلاب ہو ان سے اغماض نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اگر کسی صحیح فکر کو قبول کر لیں تو اس کی اساس پر کسی بڑے سے بڑے نظام کو چلا سکتے ہیں۔ اس پہلو سے یہ ایک بڑی قیمت رکھتے ہیں اور ان کو ضائع کرنے میں اصلی نقصان خود ان کو نہیں بلکہ سوسائٹی کو پہنچتا ہے۔ اگر عوامی انقلاب برپا کر کے یہ ختم کر دیے جائیں تو پوری سوسائٹی بالکل اس دودھ کے مانند رہ جاتی ہے جس کا مکھن نکال لیا گیا ہو۔ ایسی سوسائٹی جب انقلاب کی رستخیز سے فارغ ہو کر زندگی کی نئی تعمیر کے نقشے بناتی ہے تب اس کو اپنے دیوالیہ پن کا احساس ہوتا ہے۔ اسے علانیہ نظر آتا ہے کہ آگے کے کاموں کے لیے جو ذہنی و فکری صلاحیتیں درکار ہیں ان صلاحیتوں سے ان کی فوج بالکل خالی ہے۔ روس کے پہلے انقلاب کے بعد بالکل یہی صورت پیش آئی تھی۔ انقلاب کے خاتمہ پر جن لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت آئی وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ اپنے نظریات پر حکومت کا انتظام کس طرح چلائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آگ اور خون کی ہولی کھیل کر جو اقتدار انھوں نے حاصل کیا وہ اقتدار استعمال کے لیے انھیں انہی لوگوں کے حوالہ کرنا پڑا جن سے وہ چھینا گیا تھا۔ یہ لوگ ہنگامہ عام سے مرعوب ہو کر ان نئے نظریات کے آگے جھک تو ضرور گئے لیکن اپنے دل کے اندر ان کے خلاف سخت نفرت و عداوت چھپائے ہوئے تھے اس وجہ سے اس اقتدار کو انھوں نے مخلصانہ نہیں بلکہ منافقانہ قبول کیا اور ان کے ہاتھوں اس اشتراکی اقتدار کا حشر وہی ہوا جو کسی تحریک کا اس کو منافقانہ طور پر اختیار کرنے والوں کے ہاتھوں ہو سکتا تھا۔ انبیائے کرام علیہ السلام کا طریقہ دعوت اس قسم کی غلطیوں سے بالکل پاک ہے۔ وہ اپنی دعوت سب سے پہلے ذہین طبقہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس طبقہ میں سے جو لوگ ذہانت کے ساتھ سیرت کی بلندی بھی رکھتے ہیں وہ جب اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو ان کی تائید سے دعوت کی قوت دوچند ہو جاتی ہے۔ خیال کر

فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام۔ یہ اسی طریقِ دعوت کی برکت تھی کہ اسلام کو حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق جیسے لوگ مل گئے جنھوں نے اپنی ذہانت کی وجہ سے اصل دعوت کی فکری روح کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ وہ بذاتِ خود اصل دعوت کے شارح و مفسر بن گئے اور اپنے کردار کی پختگی کی وجہ سے اپنے اندر وہ ایسی ہمت مردانہ رکھتے تھے کہ اس کی اساس پر ایک پورا نظام اجتماعی مرتب کر کے اس کو چلا دیا اور دنیا کو دکھا دیا کہ اسلام یہ کچھ چاہتا ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ مادی اعتبار سے بھی برتر ہوتا ہے۔ یہ مادی برتری فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے کہ اس سے لازماً نفرت ہی کی جائے۔ اس کے اندر برائی کا اگر پہلو ہے تو یہ ہے کہ یہ باطل کی تائید و تقویت کا ذریعہ ہو۔ اگر باطل کے بجائے یہ حق کی تائید و تقویت کا ذریعہ ہو تو جس طرح سلیمان کی شوکت اور ذوالقرنین کی سلطنت ایک نعمت و برکت ہے اسی طرح ہر مادی برتری اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے اربابِ جاہ کو حق کی دعوت دینے میں جو اس قدر انہماک تھا اس میں جہاں اور پہلو مدنظر تھے وہاں خاص طور پر یہ چیز بھی پیشِ نظر تھی کہ اگر یہ لوگ دعوت کو قبول کر لیں گے تو یہ جن مادی وسائل پر قابض ہیں وہ آپ سے آپ حق کی نصرت و اعانت کے لیے وقف ہو جائیں گے۔ اور اس سے صرف یہی نہیں ہوگا کہ باطل کے ہاتھوں سے ایک بڑی طاقت چھن جائے گی بلکہ یہ طاقت باطل کے خلاف لڑنے کے لیے حق کے ہاتھوں میں ایک تلوار ہوگی۔ ہر دعوتِ حق کا آغاز بے سروسامانی کی حالت میں ہوتا ہے اور وہ اسی طرح آہستہ آہستہ وقت کے مادی وسائل و ذرائع ایجاد و اختراع کی قابلیتوں اور علوم و فنون کی طاقتوں کو جیت لیتی ہے اور ان کو جیت کر جب وقت آتا ہے باطل کے خلاف صف آرا کر دیتی ہے۔ اس بات کو جس طرح ہر صاحبِ دعوت چاہتا ہے اسی طرح حضرات انبیائے کرام بھی چاہتے ہیں لیکن دوسروں میں اور انبیائے کرام میں یہ فرق ہے کہ ان کے یہاں یہ چیز اس قدر اہمیت کبھی نہیں حاصل کرتی کہ اس کے آگے خود اصل مقصد غیر اہم ہو کے رہ جائے۔ اس وجہ سے جس منزل میں یہ خواہش اپنی اصلی حد سے متجاوز ہونے لگتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو روک دیا ہے کہ تم ان کے مال و جاہ کی طرف نظر نہ اٹھاؤ، تمھاری دعوت اپنا زاد و راحلہ خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ تمھارا اور تمھاری دعوت کا خود کفیل ہے۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ

اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْــَٔلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (طٰہٰ)

۵- پانچویں وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا مقصد دنیا میں ایک ایسے نظام حق کو برپا کرنا ہوتا ہے جو خدا کی بندگی، ایماندارانہ تنقید، بے رورعایت احتساب، اور شوریٰ پر مبنی ہو نہ کہ شخصیت پرستی پر۔ اس وجہ سے وہ قدرتی طور پر سب سے پہلے ان لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جن کی طبیعت میں کم از کم اتنی بلندی تو ہو کہ وہ ہمیشہ اشخاص ہی کے پیچھے چلنے کے بجائے اپنی فکر و رائے کے پیچھے چلنے کی بھی ہمت رکھتے ہوں کیونکہ جن لوگوں کے اندر یہ جوہر نہ ہو وہ اس مقصد کے لیے بیکار ہیں جس کو لے کر حضرات انبیائے کرام آتے ہیں۔ یہ جوہر رکھنے والے اشخاص یوں تو ہر طبقہ کے اندر ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن جواہرات کی تلاش بہرحال پہلے معدن ہی میں کی جاتی ہے نہ کہ مزبلہ پر۔ اس وجہ سے اپنے مقصد کے آدمی چھانٹنے کے لیے حضرات انبیائے کرام پہلے سوسائٹی کے ذہین طبقہ ہی کو مخاطب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اصول و مقاصد کے بجائے اپنی شخصیتوں کی پرستش کرانا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ ذہین طبقہ سے کترا کر عوام میں اپنی تحریک چلاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اگر کچھ سیاسی قابلیت اور ہمت رکھتے ہیں تو اپنی ڈکٹیٹرشپ[1] قائم کر لیتے ہیں اور اگر سیاسی قابلیت نہیں رکھتے یا ضعیف الہمت ہوتے ہیں تو بس ایک عوامی لیڈر ہو کے رہ جاتے ہیں اور اگر کچھ مذہبی روپ بھرنا جانتے ہیں تو ایک قسم کی پیری قائم کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ذہین طبقہ سے اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح چور دن کی روشنی سے گھبراتا ہے۔

۶- چھٹی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی سوسائٹی کے ذہین طبقہ کو چھوڑ کر اس کے عوام سے کوئی تحریک شروع کی جائے تو عوام میں سے جو لوگ اس تحریک کو قبول کر بھی لیتے ہیں وہ شبہوں اور اندیشوں میں بلا ایک قسم کے احساس کمتری کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں اور جب تک سوسائٹی کے اونچے طبقہ کے کچھ لوگ اس تحریک کے

---

[1] اس قسم کی تحریکات کا نتیجہ اگر کہیں جمہوریت کی شکل میں نمایاں ہوا ہے تو یا تو محض ظاہر فریبی ہے یا بعد کے فکری انقلاب کا نتیجہ ہے۔ ورنہ عامۃ الناس سے اٹھنے والی تحریکیں لازماً شخصی استبداد اور ڈکٹیٹرشپ پر مبنی ہوتی یا عوامی لیڈرشپ پر یا پیری پر۔

ہمنوا نہ ہو جائیں اس وقت تک ان کے اندر اس کا وہ اذعان نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اس کے اثر سے سرشار ہو کر اس کے لیے کوئی بازی کھیل سکیں۔ اس کی نفسیاتی وجہ بالکل کھلی ہوئی سی ہے کہ وہ اگرچہ خود اس تحریک کے شکار ہو چکے ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابھی ان لوگوں کو اس تحریک نے مفتوح نہیں کیا ہے جن کی ذہنی و مادی برتری وہ اب تک تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے کبھی تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ قبول نہ کرنے والوں ہی کا قصور ہو سکتا ہے اور کبھی یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ممکن ہے تحریک کے فلسفہ ہی میں کوئی ضعف ہو جو ان کو نظر آتا ہے اور ہماری نظر سے مخفی ہو۔ یہ تذبذب کی بیماری ان کو تحریک کے لیے بالکل بیکار بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور وہ اقرار کر کے بھی گویا انکار کرنے والوں ہی کی صف میں رہتے ہیں۔ حضرات انبیائے کرام کا طریقہ اس خامی سے بالکل پاک ہے۔ وہ شروع ہی میں ان لوگوں کے افکار و نظریات پر حملہ کرتے ہیں جن کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چلتا ہے اور کچھ دنوں کی کشمکش کے بعد وہ ایک طرف وقت کے اخلاقی، سیاسی اور مابعد الطبیعی فلسفہ کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیتے ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں کو ذبح کر دیتے ہیں جو اس فلسفہ پر نظام اجتماعی کو چلا رہے ہوتے ہیں۔ عوام الناس تقریباً غیر جانبدارانہ کر اس ساری کشمکش کو نہایت غور سے دیکھتے ہیں اور اندازہ کرتے ہیں کہ اس معرکہ میں حق کس کی جانب ہے۔ بعض پر جو ذہین ہوتے ہیں، پہلے ہی مرحلہ میں واضح ہو جاتا ہے کہ حق یہ ہے اور وہ اس کو قبول بھی کر لیتے ہیں اور کچھ، جو ذہین نہیں ہوتے ایک عرصہ تک تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں لیکن جب یہ کشمکش اس مرحلہ میں پہنچتی ہے جس میں باطل اپنی حمایت اور حق کے ابطال کے لیے اوچھے ہتھیاروں کے استعمال پر اتر آتا ہے تو ان کے سامنے بھی جانب حق بالکل واضح ہو کر آجاتی ہے اور وہ بھی اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ عوام الناس کے یہ دونوں گروہ حق کو قبول کرنے میں کچھ آگے پیچھے ہوتے ہیں لیکن دونوں ہی اس کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتے ہیں اس وجہ سے وہ اس احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے جس میں سابق الذکر گروہ مبتلا ہوتا ہے۔ ان کے دلوں پر سے حق کے مخالفین کا رعب بالکل اٹھ چکا ہوتا ہے۔ وہ دیکھ چکے ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کے پاس اپنے رویہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے ہٹ دھرمی اور ضد کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان کی مکاری، خود غرضی اور دجالی بازی بھی ان کی نگاہوں کے سامنے پوری طرح

آجاتی ہے اس وجہ سے ان کی دیرینہ قیادت اور سابقہ عظمت کا احترام بھی ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے۔ یہ بصیرت ان کے اندر ایک احساس برتری پیدا کردیتی ہے اور وہ "بڑوں" کی مخالفت سے جھجکنے اور ڈرنے کے بجائے ان کے مقابل میں حق کی حمایت میں ایک غیر معمولی رفعت کا احساس کرتے ہیں۔ یہ چیز ان کو ذہنی اور اخلاقی پہلو سے اتنا اونچا کردیتی ہے کہ اگرچہ وہ بے سروسامان ہوں، اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی ہو، اگرچہ ان کی تلواریں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہوں، اگرچہ ان کے تیروں پر تکوں کی بجائے جست کی جاتی ہو لیکن بڑے بڑے غرق آہن سورماؤں اور حسب و نسب اور جاہ و جلال رکھنے والے صنادید کے مقابل میں ان کو لاکر ان کے ذریعہ سے بدر کا معرکہ سر کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ ساتویں وجہ یہ ہے کہ ہر دعوت کی پائیداری اسی چیز پر ہے کہ ذہین اور اونچے طبقہ کے لوگوں میں سے اس کے حاملین ملیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو اس کی عمر بہت کم ہوجاتی ہے اور اہل بدعت جلد اس میں رخنے پیدا کرکے ساری دعوت کو خراب کردیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اوپر گذر چکا ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء و اعیان میں سے کسی نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔ صرف عوام کے طبقہ سے ان کو کچھ شاگرد ملے ان شاگردوں کے اخلاص، تقویٰ اور ادائے فرض میں شبہ نہیں لیکن اس کے باوجود پال نے بہت جلد دین مسیحی کو خراب کرڈالا اور اپنے اس فساد میں اس نے جس چیز سے سب سے زیادہ کام لیا وہ اس کا یہ پروپیگنڈا تھا کہ مسیح کے شاگرد غیر تعلیم یافتہ عوام میں سے ہیں، وہ مسیح کی تعلیمات کے اسرار و رموز کو کیا سمجھیں، وہ ان کے شاگردوں سے زیادہ ان کی باتوں کی حکمتوں کو جانتا ہے۔ اس کا یہ "پروپیگنڈا" اس قدر موثر ہوا کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جاسکا اور دین مسیحی نے بہت جلد ایک بالکل ہی مختلف شکل اختیار کرلی۔ اس کے برخلاف چونکہ اسلام کو قبول کرنے والے حضرت ابوبکر و عمر جیسے اذکیا تھے اس وجہ سے اہل بدعت اس میں آسانی رخنہ نہ پیدا کرسکے بلکہ جہاں تک کہ اسلام کی اصل دعوت کا تعلق ہے وہ ہزارہا انقلابات اور گردشوں اور اہل بدعت کی فتنہ انگیزیوں کے باوجود آج تک جوں کی توں باقی ہے۔

یہ وجوہ ہیں جن کی وجہ سے انبیائے کرام کا طریق دعوت ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے پہلے ذہین طبقہ

(باقی صفحہ ۱۳۴ پر)

تفہیم القرآن

(۲۴)

یونس

(از وسط رکوع ۱ تا رکوع ۴)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں، اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، اُن کا آخری ٹھکانا جہنم ہوگا اُن برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے) کرتے رہے[۱]

---

[۱] یہاں پھر دعوے کے ساتھ ساتھ اس کی دلیل بھی اشارۃً بیان کر دی گئی ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ عقیدۂ آخرت کے انکار کا لازمی اور قطعی نتیجہ جہنم ہے، اور دلیل یہ ہے کہ اس عقیدے سے منکر یا خالی الذہن ہو کر انسان اُن برائیوں کا اکتساب کرتا ہے جن کی پاداش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے اور ہزارہا سال کے انسانی رویہ کا تجربہ اس پر شاہد ہے۔ جو لوگ خدا کے سامنے اپنے آپ کو ذمہ دار اور جواب دہ نہیں سمجھتے، جو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے کہ انہیں آخرکار خدا کو اپنے پورے کارنامۂ حیات کا حساب دینا ہے، جو اس مفروضے پر کام کرتے ہیں کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، جن کے نزدیک کامیابی و ناکامی کا معیار صرف یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی نے کس قدر خوشحالی، آسائش، شہرت اور طاقت حاصل کی، اور جو اپنے انہی مادہ پرستانہ تخیلات کی بنا پر آیات الٰہی کو ناقابل توجہ سمجھتے ہیں، ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ جاتی ہے، وہ دنیا میں شتر بے مہار بن کر رہتے ہیں، نہایت برے اخلاق و اوصاف کا اکتساب کرتے ہیں، خدا کی زمین کو ظلم و فساد اور فسق و فجور سے بھر دیتے ہیں، اور اس بنا پر جہنم کے مستحق بن جاتے ہیں۔

یہ عقیدۂ آخرت پر ایک اور نوعیت کی دلیل ہے۔ پہلی تین دلیلیں عقلی استدلال کے قبیل سے تھیں، اور یہ تجربی استدلال کے قبیل سے ہے۔ یہاں اسے صرف اشارۃً بیان کیا گیا ہے، مگر قرآن میں مختلف مواقع پر ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا انفرادی، اور انسانی گروہوں کا اجتماعی رویہ کبھی اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب

(باقی صفحہ ۱۲۶ پر)

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے (یعنی جنہوں نے اُن صداقتوں کو قبول کر لیا جو اس کتاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵) تک یہ شعور اور یہ یقین انسانی سیرت کی بنیاد میں پیوست نہ ہو کہ ہم کو خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اب غور طلب یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اس شعور و یقین کے غائب یا کمزور ہوتے ہی انسانی سیرت و کردار کی گاڑی بُرائی کی راہ پر چل پڑتی ہے؟ اگر عقیدۂ آخرت حقیقتِ نفس الامری کے مطابق نہ ہوتا اور اُس کا انکار حقیقت کے خلاف نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس اقرار و انکار کے یہ نتائج ایک لزومی شان کے ساتھ مسلسل ہمارے تجربے میں آتے۔ ایک ہی چیز سے پیہم صحیح نتائج کا برآمد ہونا اور اس کے عدم کے نتائج کا ہمیشہ غلط ہو جانا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ چیز بجائے خود صحیح ہے۔

اس کے جواب میں بسا اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ بہت سے منکرینِ آخرت ایسے ہیں جن کا فلسفۂ اخلاق اور دستورِ عمل سراسر دہریت و مادّہ پرستی پر مبنی ہے پھر بھی وہ اچھی خاصی پاک سیرت رکھتے ہیں اور ان سے ظلم و فساد اور فسق و فجور کا ظہور نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے معاملات میں نیک اور خلقِ خدا کے خدمت گزار ہوتے ہیں۔ لیکن اس استدلال کی کمزوری بادنیٰ تامل واضح ہو جاتی ہے۔ تمام مادّہ پرستانہ لادینی فلسفوں اور نظاماتِ فکر کی جانچ پڑتال کر کے دیکھ لیا جائے۔ کہیں اُن اخلاقی خوبیوں اور عملی نیکیوں کے لئے کوئی بنیاد نہ ملے گی جن کا خراجِ تحسین ان "نیکوکار" دہریوں کو دیا جاتا ہے کسی منطق سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان لادینی فلسفوں میں راست بازی، امانت، دیانت، وفائے عہد، عدل، رحم، فیاضی، ایثار، ہمدردی، ضبطِ نفس، عفت اور حق شناسی و ادائے حقوق کے لئے محرکات موجود ہیں۔ خدا اور آخرت کو نظر انداز کر دینے کے بعد اخلاق کے لئے اگر کوئی قابلِ عمل نظام بن سکتا ہے تو وہ صرف افادیت (Utilitarianism) کی بنیادوں پر بن سکتا ہے، باقی تمام اخلاقی فلسفے محض فرضی اور کتابی ہیں نہ کہ عملی۔ اور افادیت جو اخلاق پیدا کرتی ہے اسے خواہ کتنی ہی وسعت دی جائے، بہرحال وہ اس سے آگے نہیں جاتا کہ آدمی وہ کام کرے جس کا کوئی فائدہ اِس دنیا میں اُس کی ذات کی طرف، یا اُس معاشرت کی طرف جس سے وہ تعلق رکھتا ہے، پلٹ کر آنے کی توقع ہو۔ یہ وہ چیز ہے جو فائدے کی امید اور نقصان کے اندیشے کی بنا پر انسان سے سچ اور جھوٹ، امانت اور خیانت، ایمانداری اور بے ایمانی، وفا اور غدر، انصاف اور ظلم، غرض ہر نیکی اور اس کی ضد کا حسبِ موقع ارتکاب کرا سکتی ہے۔ ان اخلاقیات کا بہترین نمونہ موجودہ زمانہ کی انگریز قوم ہے جس کو اکثر اس امر کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے کہ مادہ پرستانہ نظریۂ حیات رکھنے اور آخرت کے تصور سے خالی ہونے کے باوجود اس قوم کے افراد بالعموم دوسروں سے زیادہ سچے، کھرے، دیانتدار، عہد کے پابند،

(باقی صفحہ ۱۲۷ پر)

میں پیش کی گئی ہیں) اور نیک اعمال کرتے رہے انہیں اُن کا رب اُن کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی،[۱] وہاں ان کی صدا یہ ہو گی کہ "پاک ہے تو اے خدا"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۶) انصاف پسند اور معاملات میں قابلِ اعتماد ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افادی اخلاقیات کی ناپائیداری کا سب سے زیادہ نمایاں عملی ثبوت بھی ہم کو اسی قوم کے کردار میں ملتا ہے۔ اگر فی الواقع انگریزوں کی سچائی، انصاف پسندی، راستبازی اور عہد کی پابندی اس یقین و اذعان پر مبنی ہوتی کہ یہ صفات بجائے خود مستقل اخلاقی خوبیاں ہیں تو آخر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایک ایک انگریز تو اپنے شخصی کردار میں ان کا حامل ہوتا مگر ساری قوم مل کر جن لوگوں کو اپنا نمائندہ اور اپنے اجتماعی امور کا سربراہ کار بناتی ہے وہ بڑے پیمانے پر اس کی سلطنت اور اس کے بین الاقوامی معاملات کے چلانے میں علانیہ جھوٹ، بدعہدی، ظلم، بے انصافی اور بددیانتی سے کام لیتے اور پوری قوم کا اعتماد ان کو حاصل رہتا؟ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ لوگ مستقل اخلاقی قدروں کے قائل نہیں ہیں بلکہ دنیوی فائدے اور نقصان کے لحاظ سے بیک وقت دو متضاد اخلاقی رویے اختیار کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں؟ —— تاہم اگر کوئی منکرِ خدا و آخرت ایسا ہے جو مستقل طور پر بعض نیکیوں کا پابند اور بعض بدیوں سے مجتنب ہے تو درحقیقت اس کی یہ نیکی اور پرہیزگاری اس کے مادہ پرستانہ نظریۂ حیات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اُن مذہبی اثرات کا نتیجہ ہے جو غیر شعوری طور پر اس کے نفس میں متمکن ہیں۔ اس کا اخلاقی سرمایہ مذہب سے چرایا ہوا ہے اور اس کو وہ ناروا طریقے سے لامذہبی میں استعمال کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی لامذہبی و مادہ پرستی کے خزانے میں اس سرمائے کے ماخذ کی نشان دہی ہرگز نہیں کر سکتا۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [۱] اس جملے پر سے سرسری طور سے نہ گزر جائیے۔ اس کے مضمون کی ترتیب گہری توجہ کی مستحق ہے:

ان لوگوں کو آخرت کی زندگی میں جنت کیوں ملے گی؟ —— اس لیے کہ وہ دنیا کی زندگی میں سیدھی راہ چلے ہر کام میں، ہر شعبۂ زندگی میں، ہر انفرادی و اجتماعی معاملے میں انہوں نے برحق طریقہ اختیار کیا اور باطل طریقوں کو چھوڑ دیا۔

یہ ہر ہر قدم پر، زندگی کے ہر موڑ اور ہر دوراہے پر، اُن کو صحیح اور غلط، حق اور باطل، راست اور ناراست کی تمیز کیسے حاصل ہوئی؟ اور پھر اس تمیز کے مطابق راست روی پر ثبات اور کج روی سے پرہیز کی طاقت انہیں کہاں سے ملی؟ —— ان کے رب کی طرف سے، کیونکہ وہی علمی رہنمائی اور عملی توفیق کا منبع ہے۔

ان کا رب انہیں یہ ہدایت اور یہ توفیق کیوں دیتا رہا؟ —— ان کے ایمان کی وجہ سے۔

(باقی صفحہ ۱۲۸ پر)

ان کی دعا یہ ہوگی کہ "سلامتی ہو" اور ان کی تان ٹوٹے گی تو اس بات پر کہ "ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے^۱"۔ ع ۱

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۷) یہ نتائج جو اوپر بیان ہوئے ہیں کس ایمان کے نتائج ہیں؟ — اُس ایمان کے نہیں جو محض مان لینے کے معنی میں ہو، بلکہ اُس ایمان کے جو سیرت و کردار کی روح بن جائے اور جس کی طاقت سے اخلاق و اعمال میں صلاح کا ظہور ہونے لگے۔ جس طرح جسمانی زندگی میں آپ دیکھتے ہیں کہ بقائے حیات، تندرستی، قوتِ کار اور لذتِ زندگانی کا حصول صحیح قسم کی غذا پر موقوف ہے، لیکن یہ نتائج اُس تغذیہ کے نہیں ہیں جو محض کھا لینے کے معنی میں ہو بلکہ اس تغذیہ کے ہیں جو ہضم ہو کر خون بنے اور رگ رگ میں پہنچ کر ہر حصۂ جسم کو وہ طاقت بخشے جس سے وہ اپنے حصے کا کام ٹھیک ٹھیک کرنے لگے، اسی طرح اخلاقی زندگی میں بھی ہدایت یابی، راست بینی، راست روی اور بالآخر فلاح و کامیابی کا حصول صحیح عقائد پر موقوف ہے، مگر یہ نتائج اُن عقائد کے نہیں ہیں جو محض زبان پر جاری ہوں یا دل و دماغ کے کسی گوشے میں بے کار پڑے ہوئے ہوں بلکہ ان عقائد کے ہیں جو نفس کے اندر جذب و پیوست ہو کر اندازِ فکر اور مذاقِ طبع اور افتادِ مزاج بن جائیں اور سیرت و کردار اور رویۂ زندگی کی صورت میں نمایاں ہوں۔ خدا کے قانونِ طبیعی میں وہ شخص جو کھا کر نہ کھانے والے کی طرح رہے، اُن انعامات کا مستحق نہیں ہوتا جو کھا کر ہضم کرنے والے کے لئے رکھے گئے ہیں۔ پھر کیوں توقع کی جائے کہ اس کے قانونِ اخلاق میں وہ شخص جو مان کر نہ ماننے والے کی طرح رہے اُن انعامات کا مستحق ہو سکتا ہے جو مان کر صالح بننے والے کے لئے رکھے گئے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱ یہاں ایک لطیف انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے دارالامتحان سے کامیاب ہو کر نکلنے اور نعمت بھری جنتوں میں پہنچ جانے کے بعد یہ نہیں ہوگا کہ یہ لوگ بس وہاں پہنچتے ہی سامانِ عیش پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے اور ہر طرف سے لاؤ حوریں، لاؤ شراب اور بجے چنگ و رباب کی صدائیں بلند ہونے لگیں گی، جیسا کہ جنت کا نام سنتے ہی بعض کج فہم حضرات کے ذہن میں اس کا نقشہ گھومنے لگتا ہے، بلکہ درحقیقت صالح اہل ایمان دنیا میں افکارِ عالیہ اور اخلاقِ فاضلہ اختیار کر کے، اپنے جذبات کو سنوار کر، اپنی خواہشات کو سدھار کر، اور اپنی سیرت و کردار کو پاکیزہ بنا کر جس قسم کی بلند ترین شخصیتیں اپنی ذات میں بہم پہنچائیں گے وہی دنیا کے ماحول سے مختلف، جنت کے پاکیزہ ترین ماحول میں اور زیادہ نکھر کر ابھر آئیں گی اور ان کے وہی اوصاف، جو دنیا میں انہوں نے پرورش کیے تھے وہاں اپنی پوری شان کے

(باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

اگر کہیں[لہ] اللہ لوگوں کے ساتھ بُرا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ ان کے ساتھ بھلائی کرنے میں جلدی کرتا ہے تو ان کی مہلتِ عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی (مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے) اس لئے ہم ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اُن کی سرکشی میں بھٹکنے کے لئے چھوٹ دے دیتے ہیں۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸) ساتھ ان کی سیرت میں جلوہ گر ہوں گے۔ ان کا محبوب ترین مشغلہ وہی اللہ کی حمد و تقدیس ہوگا جس سے دنیا میں وہ مانوس تھے، اور ان کی سوسائٹی میں وہی ایک دوسرے کی سلامتی چاہنے کا جذبہ کار فرما ہوگا جسے دنیا میں انہوں نے اپنے اجتماعی رویے کی روح بنایا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) لہ اوپر کے تمہیدی فقروں کے بعد اب نصیحت اور تفہیم کی تقریر شروع ہوتی ہے۔ اس تقریر کو پڑھنے سے پہلے اس کے پس منظر سے متعلق دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں:

ایک یہ کہ اس تقریر سے تھوڑی ہی مدت پہلے سات سال کا وہ مسلسل اور سخت بلا انگیز قحط ختم ہوا تھا جس کی مصیبت سے اہلِ مکہ چیخ اُٹھے تھے۔ اس قحط کے زمانے میں قریش کے متکبرین کی اکڑی ہوئی گردنیں بہت جھک گئی تھیں۔ دعائیں اور زاریاں کرتے تھے، بت پرستی میں کمی آگئی تھی، خدائے واحد کی طرف رجوع بڑھ گیا تھا، اور نوبت یہ آگئی تھی کہ آخر کار ابوسفیان نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ خدا سے اس بلا کو ٹالنے کے لئے دعا کریں۔ مگر جب قحط دور ہوگیا، بارشیں ہونے لگیں اور خوشحالی کا دور آیا تو ان لوگوں کی وہی سرکشیاں اور بداعمالیاں، اور دینِ حق کے خلاف ان کی وہی سرگرمیاں پھر شروع ہوگئیں اور جو دل خدا کی طرف رجوع کرنے لگے تھے وہ پھر اپنی سابق غفلتوں میں ڈوب گئے۔

دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ان لوگوں کو انکارِ حق کی پاداش سے ڈراتے تھے تو یہ لوگ جواب میں کہتے تھے کہ تم جس عذابِ الٰہی کی دھمکیاں دیتے ہو وہ آخر آ کیوں نہیں جاتا۔ اس کے آنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے۔ اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ خدا لوگوں پر رحم و کرم فرمانے میں جتنی جلدی کرتا ہے ان کو سزا دینے اور ان کے گناہوں پر پکڑ لینے میں اتنی جلدی نہیں کرتا۔ تم چاہتے ہو کہ جس طرح اس نے تمہاری دعائیں سن کر بلائے قحط جلدی سے دُور کر دی، اسی طرح وہ تمہارے چیلنج سن کر اور تمہاری سرکشیاں دیکھ کر عذاب بھی فوراً بھیج دے۔ لیکن خدا کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ لوگ خواہ کتنی ہی سرکشیاں کیے جائیں وہ ان کو پکڑنے سے پہلے سنبھلنے کا کافی موقع دیتا ہے، پیہم تنبیہات بھیجتا ہے اور ڈھیلی رسی چھوڑے رکھتا ہے، یہاں تک کہ جب رعایت کی حد ہو جاتی ہے تب پاداشِ عمل کا قانون

(باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی بُرے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گذرنے والوں کے لیئے اُن کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں۔ لوگو! تم سے پہلے کی قوموں[1] کو (جو اپنے اپنے زمانہ میں برسرِ عروج تھیں) ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم[2] کی روش اختیار کی اور اُن کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لاکر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو[3]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹) نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہے خدا کا طریقہ۔ اور اس کے برعکس کم ظرف انسانوں کا طریقہ وہ ہے جو تم نے اختیار کیا کہ جب مصیبت آئی تو خدا یاد آنے لگا، بلبلانا اور گڑگڑانا شروع کر دیا، اور جہاں راحت کا دور آیا کہ سب کچھ بھول گئے۔ یہی وہ لچھن ہیں جن سے قومیں اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کا مستحق بناتی ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اصل میں لفظ "قرن" استعمال ہوا ہے جس سے مراد عام طور پر تو عربی زبان میں ایک "عہد کے لوگ" ہوتے ہیں، لیکن قرآن مجید میں جس انداز سے مختلف مواقع پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "قرن" سے مراد وہ قوم ہے جو اپنے دور میں برسرِ عروج اور کلی یا جزئی طور پر امامتِ عالم پر سرفراز رہی ہو۔ ایسی قوم کی ہلاکت لازماً یہی معنی نہیں رکھتی کہ اس کی نسل کو بالکل غارت ہی کر دیا جائے، بلکہ اس کا مقام عروج و امامت سے گرا دیا جانا، اس کی تہذیب و تمدن کا تباہ ہو جانا، اس کے تشخص کا مٹ جانا اور اس کے اجزاء کا پارہ پارہ ہو کر دوسری قوموں میں گم ہو جانا بھی ہلاکت کی ایک صورت ہے۔

[2] یہ لفظ ظلم ان محدود معنوں میں نہیں ہے جو عام طور پر اس سے مراد لیئے جاتے ہیں، بلکہ یہ ان تمام گناہوں پر حاوی ہے جو انسان بندگی کی حد سے گزر کر کرتا ہے۔ تشریح کے لئے ملاحظہ ہوں حواشی سورۂ بقرہ رکوع ۴۔

[3] خیال رہے کہ خطاب اہلِ عرب سے ہو رہا ہے۔ اور ان سے کہا یہ جا رہا ہے کہ پچھلی قوموں کو اپنے اپنے زمانہ میں کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا، مگر انہوں نے آخر کار ظلم و بغاوت کی روش اختیار کی اور جو انبیاء ان کو راہِ راست دکھانے کے لیئے بھیجے گئے تھے ان کی بات انہوں نے نہ مانی، اس لیئے وہ ہمارے امتحان میں ناکام ہوئیں اور میدان سے ہٹا دی گئیں۔ اب اے اہلِ عرب تمہاری باری آئی ہے۔ تمہیں ان کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تم اُس امتحان گاہ میں کھڑے ہو جس

(باقی صفحہ ۱۳۱ پر)

جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ "اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو"[1] اے محمدؐ! ان سے کہو "میں اپنی طرف سے کوئی تغیر و تبدل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، میں تو بس اُس فرمان کا تابع ہوں جو وحی کے ذریعہ سے مجھ کو بھیجا جاتا ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے"[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۰) تمہارے پیش رو ناکام ہوکر نکالے جا چکے ہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو جو ان کا ہوا تو اس موقع سے، جو تمہیں دیا جا رہا ہے، صحیح فائدہ اُٹھاؤ، پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق لو اور ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرو جو ان کی تباہی کی موجب ہوئیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اُن کا یہ قول اوّل تو اس مفروضے پر مبنی تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پیش کر رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے دماغ کی تصنیف ہے اور اس کو خدا کی طرف منسوب کر کے انہوں نے صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ ان کی بات کا وزن بڑھ جائے۔ دوسرے، ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ تم نے توحید اور آخرت اور اخلاقی پابندیوں کی بحث کیا چھیڑ دی، اگر رہنمائی کے لیے اُٹھے ہو تو کوئی ایسی چیز پیش کرو جس سے قوم کا بھلا ہو اور اس کی دنیا بنتی نظر آئے۔ تاہم اگر تم اپنی اس دعوت کو بالکل نہیں بدلنا چاہتے تو کم از کم اس میں اتنی لچک پیدا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کم و بیش پر مصالحت ہو سکے۔ کچھ ہم تمہاری مانیں، کچھ تم ہماری مان لو۔ تمہاری توحید میں کچھ ہمارے شرک کے لیے، تمہاری خدا پرستی میں کچھ ہماری نفس پرستی اور دنیا پرستی کے لئے اور تمہارے عقیدۂ آخرت میں کچھ ہماری ان امیدوں کے لیے بھی گنجائش نکلنی چاہیے کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کرتے رہیں، آخرت میں کسی کی سعی و سفارش اور کسی کے دامن سے وابستگی ہم کو نجات دلا دے گی۔ اسی طرح تمہارے یہ قطعی اور حتمی اخلاقی اصول بھی ہمارے لئے ناقابل قبول ہیں۔ ان میں کچھ ہمارے تعصبات کے لئے، کچھ ہمارے رسم و رواج کے لئے، کچھ ہماری شخصی اور قومی اغراض کے لئے اور کچھ ہماری خواہشات نفس کے لئے بھی جگہ نکلنی چاہیے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ دین کے مطالبات کا ایک مناسب دائرہ ہماری اور تمہاری رضامندی سے طے ہو جائے اور اس میں ہم خدا کا حق ادا کر دیا کریں، پھر ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس جس طرح اپنی دنیا کے کام چلانا چاہتے ہیں چلائیں۔ مگر تم تو یہ غضب کر رہے ہو کہ پوری زندگی اور سارے معاملات کو توحید و آخرت کے عقیدے اور شریعت کے ضابطہ سے کس دینا چاہتے ہو۔

[2] یہ اوپر کی دونوں باتوں کا جواب ہے۔ اس میں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ

(باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

اور کہو "اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمہیں سناؤں تو میں کبھی نہ سنا سکتا تھا بلکہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دے سکتا تھا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے"؟ ؎۱

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱) یہ وحی کے ذریعہ سے میرے پاس آئی ہے جس میں کسی ردو بدل کا مجھے اختیار نہیں۔ اور یہ بھی کہ اس معاملہ میں مصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں، قبول کرنا ہو تو اس پورے دین کو جوں کا توں قبول کرو ورنہ پورے کو رد کردو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ؎۱ یہ ایک زبردست دلیل ہے اُن کے اِس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر نسبتاً دور کی چیز تھے، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو اُن کے لئے قریب ترین چیز تھی۔ آپ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے، ان کی آنکھوں کے سامنے بچپن گزارا، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے۔ رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انہی کے ساتھ تھا اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔ آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا:

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے، اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے جو اب قرآن کی ان پے در پے سورتوں میں زیر بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو جو آپ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ خارج سے آپ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے۔ اس لئے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اُس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض ہوشیار لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن

(باقی صفحہ ۱۳۳ پر)

پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے؟[1] یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔[2]"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۲) کو آپ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمدؐ کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی، کیونکہ مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر اُنگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے۔

دوسری بات جو آپ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پیش آیا تھا وہ آپ کو ایک نہایت سچے، بے داغ، اور قابل اعتماد (امین) انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا ہو [illegible] ایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل و فریب لے کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور اور تحدی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔

اسی بنا پر ان کے الزام کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے بندو، کچھ عقل سے تو کام لو، میں کوئی باہر سے آیا ہوا اجنبی آدمی نہیں ہوں، تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک عمر گزار چکا ہوں، میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم کیسے یہ توقع مجھ سے کر سکتے ہو کہ میں خدا کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر یہ قرآن تمہارے سامنے پیش کر سکتا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی اگر یہ آیات خدا کی نہیں ہیں اور میں انہیں [illegible] کرکے آیاتِ الٰہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں تو مجھ سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر یہ واقعی اللہ کی آیات ہیں اور تم ان کو جھٹلا رہے ہو تو پھر تم سے بڑا بھی کوئی ظالم نہیں۔

[2] بعض نادان لوگ "فلاح" کو طویل عمر، یا دنیوی خوشحالی، یا دنیوی فروغ کے معنی میں لیتے ہیں، اور اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرکے جیتا رہے یا [illegible] میں پھلے پھولے، یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو
(باقی صفحہ ۱۳۴ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۳) اسے نبی برحق مان لینا چاہیئے کیونکہ اس نے فلاح پائی اگر وہ نبی برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا، یا بھوکوں مار دیا جاتا اور دنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی۔ یہ احمقانہ استدلال صرف وہی کرسکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاحِ "فلاح" کا مفہوم جانتا ہو، نہ اُس قانونِ امہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لئے مقرر فرمایا ہے، اور نہ یہی سمجھتا ہو کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ فقرہ کس معنی میں آیا ہے۔

اول تو یہ بات کہ "مجرم فلاح نہیں پا سکتے" اس سیاق میں اس حیثیت سے فرمائی ہی نہیں گئی ہے کہ یہ کسی کے دعوائے نبوت کو پرکھنے کا معیار ہے جس سے عام لوگ جانچ کر خود فیصلہ کریں کہ جو مدعی نبوت فلاح پا رہا ہو اس کے دعوے کو مانیں اور جو فلاح نہ پا رہا ہو اس کا انکار کر دیں۔ بلکہ یہاں تو یہ بات اس معنی میں کہی گئی ہے کہ "میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی، اس لئے میں خود تو یہ جرم نہیں کر سکتا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کروں، البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم سچے نبی کو جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو اس لئے تمہیں فلاح نصیب نہیں ہوگی"۔

پھر فلاح کا لفظ بھی قرآن میں دنیوی فلاح کے محدود معنی میں نہیں آیا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ پائیدار کامیابی ہے جو کسی خسران پر منتج ہونے والی نہ ہو، قطع نظر اس سے کہ دنیوی زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں اس کے اندر کامیابی کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک داعی ضلالت دنیا میں مزے سے جئے، خوب پھلے پھولے اور اس کی گمراہی کو بڑا فروغ نصیب ہو، مگر یہ قرآن کی اصطلاح میں فلاح نہیں، عین خسران ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک داعی حق دنیا میں سخت مصیبتوں سے دوچار ہو، شدتِ آلام سے نڈھال ہو کر یا ظالموں کی دست درازیوں کا شکار ہو کر دنیا سے جلدی رخصت ہو جائے، اور کوئی اسے مان کر نہ دے، مگر یہ قرآن کی زبان میں خسران نہیں، عین فلاح ہے۔

علاوہ بریں قرآن میں جگہ جگہ یہ بات پوری تشریح کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کیا کرتا، بلکہ انہیں سنبھلنے کے لئے کافی مہلت دیتا ہے، اور اگر وہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اور زیادہ بگڑتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اور بسا اوقات ان کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی تمام شرارتوں کو پوری طرح ظہور میں لے آئیں اور واقعات کی رو سے اس سزا کے مستحق بنیں جس کے وہ اپنی خواہشات کی رو سے فی الحقیقت مستحق ہیں پس اگر کسی جھوٹے مدعی کی رسی دراز ہو رہی ہو اور اس پر دنیوی فلاح کی برسات برس رہی ہو تو سخت غلطی ہوگی اگر اس کی اس حالت کو اس کے برسرِ ہدایت ہونے کی دلیل سمجھا جائے۔ خدا کا

(باقی صفحہ ۱۳۵ پر)

یہ لوگ اللہ کے سوا اُن کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے محمدؐ! ان سے کہو "کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟"[1] پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ابتداءً سارے انسان ایک ہی امت تھے، بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴) قانون امہال و استدراج جس طرح تمام مجرموں کے لیے عام ہے اسی طرح جھوٹے مدعیان نبوت کے لیے بھی ہے اور ان کے اس سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر شیطان کو قیامت تک کے لیے جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس میں بھی یہ استثنا کہیں مذکور نہیں ہے کہ تیرے اور تو سارے فریب چلنے دیئے جائیں گے لیکن اگر تو اپنی طرف سے کوئی نبی گھڑ لائے گا تو یہ فریب نہ چلنے دیا جائے گا۔

ممکن ہے کوئی شخص ہماری اس بات کے جواب میں وہ آیت پیش کرے جو سورہ الحاقہ رکوع ۲ میں ارشاد ہوئی ہے کہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ۔ یعنی اگر محمدؐ نے خود گھڑ کر کوئی بات ہمارے نام سے کہی ہوتی تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ دل کاٹ ڈالتے۔ لیکن اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جو شخص فی الواقع خدا کی طرف سے نبی مقرر کیا گیا ہو وہ اگر کوئی بات گھڑ کر وحی کی حیثیت سے پیش کرے تو فوراً پکڑا جائے۔ اس سے یہ استدلال کرنا کہ جو مدعی نبوت پکڑا نہیں جاتا وہ ضرور سچا ہے، ایک منطقی مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خدا کے قانون امہال و استدراج میں جو استثناء اس آیت سے ثابت ہوتا ہے وہ صرف سچے نبی کے لیے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے وہ بھی اس قانون سے مستثنیٰ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سرکاری ملازموں کے لیے حکومت نے جو قانون بنایا ہو اس کا اطلاق صرف انہی لوگوں پر ہوگا جو واقعی سرکاری ملازم ہوں۔ رہے وہ لوگ جو جعلی طور پر اپنے آپ کو ایک سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے پیش کریں، تو ان پر ضابطۂ ملازمت کا نفاذ نہ ہوگا بلکہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائیگا جو دوسرے بدمعاشوں اور مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں سورۃ الحاقہ کی اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ بھی اس غرض کے لیے نہیں فرمایا گیا کہ لوگوں کو نبی کے پرکھنے کا یہ معیار بتایا جائے کہ اگر پردۂ غیب سے کوئی ہاتھ نمودار ہو کر اس کی رگ دل اچانک کاٹ لے تو سمجھیں جھوٹا ہے ورنہ مان لیں کہ سچا ہے۔ نبی کے صادق یا کاذب ہونے کی جانچ اگر اسکی سیرت، اس کے کام، اور اُس چیز سے جو وہ پیش کر رہا ہو، ممکن نہ ہوتی تو ایسے غیر معقول معیار تجویز کرنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، اس لیے کہ سب کچھ جو موجود ہے اللہ کے علم میں ہے۔ پس سفارشیوں کے معدوم ہونے کے لیے یہ ایک نہایت لطیف انداز بیان

(باقی صفحہ ۱۳۶ پر)

بنا لیے،[۵۱] اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر لی گئی ہوتی تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دیا جاتا۔[۵۲]

اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی[۵۳] کیوں نہ اُتاری گئی، تو ان سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵) ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین یا آسمان میں کوئی اس کے حضور تمہاری سفارش کرنے والا ہے پھر یہ تم کن سفارشیوں کی اس کو خبر دے رہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] اس مضمون کی تشریح سورۂ بقرہ رکوع ۲۶ کے حواشی میں کی جا چکی ہے۔

[۵۲] یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ فیصلہ نہ کر لیا ہوتا کہ حقیقت کو انسانوں کے حواس سے پوشیدہ رکھ کر ان کی عقل و فہم اور ضمیر و وجدان کو آزمائش میں ڈالا جائیگا اور جو اس آزمائش میں ناکام ہو کر غلط راہ پر جانا چاہیں گے انہیں اس راہ پر جانے اور چلنے کا موقع دیا جائے گا، تو حقیقت کو آج ہی بے نقاب کر کے سارے اختلافات کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔

یہاں یہ بات ایک بڑی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیئے بیان کی گئی ہے عام طور پر آج بھی لوگ اس الجھن میں ہیں اور نزول قرآن کے وقت بھی تھے کہ دنیا میں بہت سے مذہب پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب والا اپنے ہی مذہب کو حق سمجھتا ہے ایسی حالت میں آخر اس فیصلے کی صورت کیا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون نہیں۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ یہ اختلاف مذاہب دراصل بعد کی پیداوار ہے۔ ابتداء میں تمام نوع انسانی کا مذہب ایک تھا اور وہی مذہب حق تھا، پھر اس حق میں اختلاف کر کے لوگ مختلف عقیدے اور مذہب بناتے چلے گئے۔ اب اگر اس ہنگامۂ مذاہب کا فیصلہ تمہارے نزدیک عقل و شعور کے صحیح استعمال کے بجائے صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خدا خود حق کو بے نقاب کر کے سامنے لے آئے تو یہ موجودہ دنیوی زندگی میں نہیں ہوگا، یہ تو امتحان گاہ ہے اور یہاں سارا امتحان ہے ہی اس بات کا کہ تم حق کو دیکھے بغیر عقل و شعور سے پہچانتے ہو یا نہیں۔

[۵۳] یعنی اس بات کی نشانی کہ یہ واقعی نبی برحق ہے اور جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ بالکل درست ہے اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہے کہ نشانی کے لئے ان کا یہ مطالبہ کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ وہ سچے دل سے دعوت حق کو قبول کرنے اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنے اخلاق کو، عادات کو، نظام معاشرت و تمدن کو، غرض اپنی پوری زندگی کو ڈھال لینے کے لئے تیار تھے اور بس اسی وجہ سے ٹھیرے ہوئے تھے کہ نبی کی تائید میں کوئی نشانی ابھی انہوں نے ایسی نہیں دیکھی تھی جس سے

(باقی صفحہ ۱۲۷ پر)

ع ۲ کہو "غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے، اچھا، انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں"[۱]۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملہ میں چال بازیاں شروع کر دیتے ہیں[۲]۔ ان سے کہو "اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶) اس کی نبوت کا یقین آجائے۔ اصل بات یہ تھی کہ نشانی کا یہ مطالبہ محض ایمان نہ لانے کے لئے ایک بہانے کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ جو کچھ بھی ان کو دکھا دیا جاتا اس کے بعد وہ یہی کہتے کہ کوئی نشانی تو ہم کو دکھائی ہی نہیں گئی۔ اس لئے کہ وہ ایمان لانا چاہتے نہ تھے۔ دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو اختیار کرنے میں یہ جو آزادی ان کو حاصل تھی کہ نفس کی خواہشات و رغبات کے مطابق جس طرح چاہیں کام کریں اور جس چیز میں لذت یا فائدہ محسوس کریں اس کے پیچھے لگ جائیں، اس کو چھوڑ کر وہ ایسی غیبی حقیقتوں (توحید و آخرت) کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے جنہیں مان لینے کے بعد ان کو اپنا سارا نظام حیات مستقل اخلاقی اصولوں کی بندش میں باندھنا پڑ جاتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی جو کچھ اللہ نے اُتارا ہے وہ تو میں نے پیش کر دیا، اور جو اس نے نہیں اُتارا وہ میرے اور تمہارے لئے "غیب" ہے جس پر سوائے خدا کے کسی کا اختیار نہیں، وہ چاہے تو اُتارے اور نہ چاہے تو نہ اُتارے۔ اب اگر تمہارا ایمان لانا اسی پر موقوف ہے کہ جو خدا نے نہیں اُتارا ہے وہ اترے تو اس کے انتظار میں بیٹھے رہو، میں بھی دیکھوں گا کہ تمہاری یہ ضد پوری کی جاتی ہے یا نہیں۔

[۲] یہ پھر اُسی قحط کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر دوسرے رکوع میں گذر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نشانی آخر کس منہ سے مانگتے ہو۔ ابھی جو قحط تم پر گزرا ہے اس میں تم اپنے اُن معبودوں سے مایوس ہو گئے تھے جنہیں تم نے اللہ کے ہاں اپنا سفارشی ٹھیرا رکھا تھا اور جن کے متعلق کہا کرتے تھے کہ فلاں آستانے کی نیاز تو تیر بہدف ہے، اور فلاں درگاہ پر چڑھاوا چڑھانے کی دیر ہے کہ مُراد بر آتی ہے۔ تم نے دیکھ لیا کہ ان نام نہاد خداؤں کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اور سارے اختیارات کا مالک صرف اللہ ہے۔ اسی وجہ سے تو آخر کار تم اللہ ہی سے دُعائیں مانگنے لگے تھے۔ کیا یہ کافی نشانی نہ تھی کہ تمہیں اُس تعلیم کے برحق ہونے کا یقین آجاتا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو دے رہے ہیں؟ مگر اس نشانی کو دیکھ کر تم نے کیا کیا؟ جونہی کہ قحط دور ہوا اور باران رحمت نے تمہاری مصیبت کا خاتمہ کر دیا، تم نے اس بلا کے آنے اور پھر اس کے دور ہونے کے متعلق ہزار قسم کی توجیہیں اور تاویلیں (چالبازیاں) کرنی شروع کر دیں تاکہ توحید کو ماننے سے بچ سکو اور اپنے

(باقی صفحہ ۱۳۸ پر)

اُس کے فرشتے تمہاری سب مکاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں[۱]۔ وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے، چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اُس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیئے خالص کر کے اُس سے دُعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گذار بندے بنیں گے[۲]"۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو! تمہاری یہ بغاوت اُلٹی تمہارے ہی خلاف پڑ رہی ہے، دنیا کے چند روزہ مزے ہیں (لُوٹ لو) پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے، اُس وقت ہم تمہیں بتادیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہو گئی، پھر عین اُس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہیں یکایک رات کو یا دن کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷) شرک پر جمے رہو۔ اب جن لوگوں نے اپنے ضمیر کو اِس درجہ خراب کر لیا ہو انہیں آخر کونسی نشانی دکھائی جائے اور اس کے دکھانے سے حاصل کیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اللہ کی چال سے مراد یہ ہے کہ اگر تم حقیقت کو نہیں مانتے اور اس کے مطابق اپنا رویہ درست نہیں کرتے تو وہ تمہیں اسی باغیانہ روش پر چلتے رہنے کی چھوٹ دے دیگا، تم کو جیتے جی اپنے رزق اور اپنی نعمتوں سے نوازتا رہے گا جس سے تمہارا نشۂ زندگانی یونہی تمہیں مست کیئے رکھے گا، اور اس مستی کے دوران میں جو کچھ تم کرو گے وہ سب اللہ کے فرشتے خاموشی کے ساتھ بیٹھے لکھتے رہیں گے، حتیٰ کہ اچانک موت کا پیغام آجائے گا اور تم اپنے کرتوتوں کا حساب دینے کے لئے دھر لیئے جاؤ گے۔

[۲] یہ توحید کے برحق ہونے کی نشانی ہر انسان کے نفس میں موجود ہے۔ جب تک اسباب سازگار رہتے ہیں، انسان خدا کو بھولا اور دنیا کی زندگی پر پھولا رہتا ہے۔ جہاں اسباب نے ساتھ چھوڑا اور وہ سب سہارے جن کے بل پر جی رہا تھا ٹوٹ گئے، پھر کٹے سے کٹے مشرک اور سخت سے سخت دہریے کے قلب سے بھی یہ شہادت اُبلنی شروع ہو جاتی ہے کہ اس سارے

(باقی صفحہ ۱۳۹ پر)

ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیئے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔ (تم اس ناپائیدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو) اور اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے[1]، (ہدایت اس کے اختیار میں ہے) جس کو وہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیئے بھلائی ہے اور مزید فضل[2]۔ ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلت نہ چھائے گی، وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی بدلہ وہ پائیں گے[3]، ذلت ان پر مسلط ہوگی، کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہوگا، ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہوگی[4] جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں، وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ جس روز ہم ان سب کو ایک ساتھ (اپنی عدالت میں) اکٹھا کریں گے، پھر ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا ہے کہیں گے کہ ٹھیر جاؤ تم بھی اور تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے[5]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۸) عالم اسباب پر کوئی خدا کارفرما ہے اور وہ ایک ہی خدائے غالب و توانا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے اُس طریقے کی طرف جو آخرت کی زندگی میں تم کو دارالسلام کا مستحق بنائے۔ دارالسلام سے مراد جنت ہے، اور اس کے معنی ہیں سلامتی کا گھر، وہ جگہ جہاں کوئی آفت، کوئی نقصان، کوئی رنج اور کوئی تکلیف نہ ہو۔

[2] یعنی ان کو صرف ان کی نیکی کے مطابق ہی اجر نہیں ملے گا بلکہ اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید انعام بھی بخشے گا

[3] یعنی نیکوکاروں کے برعکس بدکاروں کے ساتھ معاملہ یہ ہوگا کہ جتنی بدی ہے اتنی ہی سزا دی جائے گی۔ ایسا نہ ہوگا کہ جرم سے ذرہ برابر بھی زیادہ سزا دی جائے۔

[4] وہ تاریکی جو مجرموں کے چہرے پر پکڑے جانے اور بچاؤ سے مایوس ہو جانے کے بعد چھا جاتی ہے۔

[5] متن میں فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ کے الفاظ ہیں۔ اس کا مفہوم بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ ہم ان کا باہمی ربط و تعلق توڑ دیں گے تاکہ کسی تعلق کی بنا پر وہ ایک دوسرے کا لحاظ نہ کریں۔ لیکن یہ معنی عربی محاورے کے مطابق نہیں ہیں۔ محاورۂ عرب کی رو سے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے درمیان تمیز پیدا کر دیں گے، یا ان کو ایک دوسرے سے ممیز کر دیں گے

(باقی صفحہ ۱۴۰ پر)

اور ان کے شریک کہیں گے کہ "تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے ! ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ (تم اگر ہماری عبادت کرتے بھی تھے تو) ہم تمہاری اس عبادت سے بالکل بے خبر تھے"۔[۱] اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزا چکھ لے گا، سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیر دیے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے۔ ع۳

ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے ؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں ؟ کون بے جان میں سے جان دار کو اور جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے[۲]؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے ؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو، پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے ؟ تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے[۳]۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) اسی معنی کو ادا کرنے کے لیے ہم نے یہ طرز بیان اختیار کیا ہے کہ "ان کے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹا دیں گے"، یعنی مشرکین اور ان کے معبود آمنے سامنے کھڑے ہوں گے اور دونوں گروہوں کی امتیازی حیثیت ایک دوسرے پر واضح ہوگی، مشرکین جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جن کو ہم دنیا میں معبود بنائے ہوئے تھے، اور ان کے معبود جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جنھوں نے ہمیں اپنا معبود بنا رکھا تھا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] یعنی وہ تمام فرشتے، جن کو دنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پوجا گیا، اور وہ تمام جن، ارواح، اسلاف، اجداد، انبیاء، اولیا، شہدا، وغیرہ جن کو خدائی صفات میں شریک ٹھہرا کر وہ حقوق انھیں ادا کیے گئے جو دراصل خدا کے حقوق تھے، وہاں اپنے پرستاروں سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہماری عبادت بجا لائے تمہاری کوئی دعا، کوئی التجاء، امداد و اعانت، کوئی نذر و نیاز، کوئی چڑھاوے کی چیز، کوئی تعریف و مدح اور ہمارے نام کی جاپ، اور کوئی سجدہ ریزی و آستانہ بوسی و درگاہ گردی ہم تک نہیں پہنچی۔

[۲] یعنی بے جان مادہ میں سے ذی حیات مخلوق کو، اور ذی حیات مخلوقات میں سے بے جان مادوں کو۔

[۳] یعنی اگر یہ سارے کام اللہ کے ہیں، جیسا کہ تم خود مانتے ہو تب تو تمہارا حقیقی پروردگار، مالک، آقا، اور تمہاری بندگیٔ و عبادت کا حق دار اللہ ہی ہوا۔ یہ دوسرے جن کا ان کاموں میں کوئی حصہ نہیں آخر ربوبیت میں کہاں سے شریک ہو گئے۔

آخر تم یہ کدھر پھرائے جا رہے ہو؟[۵۱] (اے نبی! دیکھو) اس طرح نافرمانی اختیار کرنے والوں پر تمہارے رب کی بات صادق آگئی کہ وہ مان کر نہ دیں گے۔[۵۲]

ان سے پوچھو، تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے؟ ——— کہو وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی،[۵۳] پھر تم یہ کس الٹی راہ پر چلائے جا رہے ہو؟[۵۴]

---

۵۱ خیال رہے کہ خطاب عام لوگوں سے ہے، اور ان سے سوال یہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ "تم کدھر پھرے جاتے ہو" بلکہ یہ ہے کہ "تم کدھر پھرائے جا رہے ہو"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی گمراہ کُن ہے جو لوگوں کو صحیح رُخ سے ہٹا کر غلط رُخ پر پھیر رہا ہے، اور لوگوں سے اپیل یہ کیا جا رہا ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنمائی کرنے والوں کے پیچھے کیوں چلے جا رہے ہو، اپنی گرہ کی عقل سے کام لے کر سوچتے کیوں نہیں کہ جب حقیقت یہ ہے، تو آخر یہ تم کو کدھر چلایا جا رہا ہے۔ یہ طرزِ سوال جگہ جگہ ایسے مواقع پر قرآن میں اختیار کیا گیا ہے، اور ہر جگہ گمراہ کرنے والوں کا نام لینے کے بجائے ان کو صیغۂ مجہول کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے، تاکہ ان کے معتقدین ٹھنڈے دل سے اپنے معاملہ پر غور کر سکیں، اور کسی کو یہ کہہ کر انھیں اشتعال دلانے اور ان کا دماغی توازن بگاڑ دینے کا موقع نہ ملے کہ دیکھو یہ تمہارے بزرگوں اور پیشواؤں پر چوٹیں کی جا رہی ہیں۔ اس میں حکمتِ تبلیغ کا ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس سے غافل نہ رہنا چاہیے۔

۵۲ یعنی ایسی کھلی کھلی اور عام فہم دلیلوں سے بات سمجھائی جاتی ہے لیکن جنھوں نے نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے وہ اپنی ضد کی بنا پر کسی طرح مان کر نہیں دیتے۔

۵۳ تخلیق کی ابتدا کے متعلق تو مشرکین مانتے ہی تھے کہ یہ صرف اللہ کا کام ہے، ان کے شریکوں میں سے کسی کا اس کام میں کوئی حصہ نہیں۔ رہا تخلیق کا اعادہ تو ظاہر ہے کہ جو ابتداءً پیدا کرنے والا ہے وہی اس عمل پیدائش کا اعادہ بھی کر سکتا ہے، مگر جو ابتداءً ہی پیدا کرنے پر قادر نہ ہو وہ کس طرح اعادۂ پیدائش پر قادر ہو سکتا ہے۔ یہ بات اگرچہ صریحاً ایک معقول بات ہے، اور خود مشرکین کے دل بھی اندر سے اس کی گواہی دیتے تھے کہ بات بالکل ٹھکانے کی ہے لیکن انھیں اس کا اقرار کرنے میں اس بنا پر تامل تھا کہ اسے مان لینے کے بعد انکارِ آخرت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر کے سوالات پر تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ خود کہیں گے کہ یہ کام اللہ کے ہیں، مگر یہاں اس کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے کہ تم ڈنکے کی چوٹ کہو کہ یہ ابتدائے خلق اور اعادۂ خلق کا کام بھی اللہ ہی کا ہے۔

۵۴ یعنی جب تمہاری ابتدا کا سرا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انتہا کا سرا بھی اسی کے ہاتھ میں، تو خود اپنے خیر خواہ بن کر ذرا سوچو کہ آخر تمہیں یہ کیا باور کرایا جا رہا ہے کہ ان دونوں سروں کے بیچ میں اللہ کے سوا کسی اور کو تمہاری بندگیوں اور نیاز مندیوں کا حق پہنچ جاتا ہے۔

ان سے پوچھو تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟[۵۱] ــــ کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر بھلا بتاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو رہنمائی نہیں کرسکتا الّا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو۔

۵۱ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ دنیا میں انسان کی ضرورتوں کا دائرہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے کہ اس کو کھانے پینے، پہننے اور زندگی بسر کرنے کا سامان بہم پہنچے اور آفات، مصائب اور نقصانات سے وہ محفوظ رہے، بلکہ اس کی ایک ضرورت (اور درحقیقت سب سے بڑی ضرورت) یہ بھی ہے کہ اسے دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو اور وہ جانے کہ اپنی ذات کے ساتھ، اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ، اُس سروسامان کے ساتھ جو روئے زمین پر اس کے تصرف میں ہے، ان بے شمار انسانوں کے ساتھ جن سے مختلف حیثیتوں میں اس کو سابقہ پیش آتا ہے، اور مجموعی طور پر اُس نظامِ کائنات کے ساتھ جس کے ماتحت رہ کر ہی بہرحال اس کو کام کرنا ہے، وہ کیا اور کس طرح معاملہ کرے جس سے اس کی زندگی بحیثیت مجموعی کامیاب ہو اور اس کی کوششیں اور محنتیں غلط راہوں میں صرف ہو کر تباہی و بربادی پر منتج نہ ہوں۔ اسی صحیح طریقہ کا نام "حق" ہے اور جو رہنمائی اس طریقہ کی طرف انسان کو لے جائے وہی "ہدایتِ حق" ہے۔ اب قرآن تمام مشرکین سے اور ان سب لوگوں سے جو پیغمبر کی تعلیم کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، یہ پوچھتا ہے کہ تم خدا کے سوا جن جن کی بندگی کرتے ہو ان میں کوئی ہے جو تمہارے لیے "ہدایتِ حق" حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہو یا بن سکتا ہو؟ ــــ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان خدا کے سوا جن کی بندگی کرتا ہے وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہیں:

ایک وہ دیویاں، دیوتا اور زندہ یا مردہ انسان جن کی پرستش کی جاتی ہے۔ سو ان کی طرف تو انسان کا رجوع صرف اس غرض کے لیے ہوتا ہے کہ فوق الفطری طریقے سے وہ اس کی حاجتیں پوری کریں اور اس کو آفات سے بچائیں۔ رہی ہدایتِ حق، تو وہ نہ کبھی ان کی طرف سے آئی، نہ کبھی کسی مشرک نے اس کے لیے اُنکی طرف رجوع کیا، اور نہ کوئی مشرک یہ کہتا ہے کہ اس کے یہ معبود اسے اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، قانون، عدالت وغیرہ کے اصول سکھاتے ہیں۔

دوسرے وہ انسان جن کے بنائے ہوئے اصولوں اور قوانین کی پیروی و اطاعت کی جاتی ہے، سو وہ رہنما تو ضرور ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع وہ "رہنمائے حق" بھی ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی کا علم بھی اُن تمام حقائق پر حاوی ہے جن کو جانے بغیر انسانی زندگی کے لیے صحیح اصول وضع نہیں کیے جا سکتے؟ کیا ان میں سے کسی کی نظر بھی اُس پورے دائرے پر پھیلتی ہے جس میں انسانی زندگی سے تعلق

(باقی صفحہ ۱۴۳ پر)

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض قیاس و گمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں[۱]۔ حالانکہ گمان علمِ حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے۔ بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے[۲]۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲) رکھنے والے مسائل پھیلے ہوئے ہیں؟ کیا ان میں سے کوئی بھی اُن کمزوریوں سے، ان تعصبات سے، اُن شخصی یا گروہی دلچسپیوں سے، اُن اغراض و خواہشات سے، اور اُن رجحانات و میلانات سے بالاتر ہے جو انسان کی قوتِ فیصلہ کو لازماً متاثر کرتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے، اور ظاہر ہے کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا تو آخر یہ لوگ "ہدایتِ حق" کا سرچشمہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

اسی بنا پر قرآن یہ سوال کرتا ہے کہ لوگو! تمہارے ان مذہبی اور تمدنی معبودوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو راہِ راست کی طرف تمہاری رہنمائی کرنے والا ہو؟ اوپر کے سوالات کے ساتھ مل کر یہ آخری سوال دین و مذہب کے پورے مسئلے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ انسان کی ساری ضرورتیں دو ہی نوعیت کی ہیں۔ ایک نوعیت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی اس کا پروردگار ہو، کوئی ملجا و ماویٰ ہو، کوئی دعاؤں کا سننے والا اور حاجتوں کا پورا کرنے والا ہو جس کا مستقل سہارا اس عالمِ اسباب کے بے ثبات سہاروں کے درمیان رہتے ہوئے وہ تھام سکے۔ سو اوپر کے سوالات نے فیصلہ کر دیا کہ اس ضرورت کو پورا کرنے والا خدا کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دوسری نوعیت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی ایسا رہنما ہو جو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے صحیح اصول بتائے اور جس کی پیروی پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ کی جا سکے۔ سو اس آخری سوال نے اس کا فیصلہ بھی کر دیا کہ وہ بھی صرف خدا ہی ہے۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی جس کی بنا پر انسان مشرکانہ مذاہب اور لادینی اصولِ تمدن و اخلاق و سیاست سے چمٹا رہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] یعنی جنھوں نے مذاہب بنائے، جنھوں نے فلسفے تصنیف کیے، اور جنھوں نے قوانینِ حیات تجویز کیے انھوں نے بھی یہ سب کچھ علم کی بنا پر نہیں بلکہ گمان و قیاس کی بنا پر کیا، اور جنھوں نے ان مذہبی اور دنیوی رہنماؤں کی پیروی کی انھوں نے بھی جان کر اور سمجھ کر نہیں بلکہ محض اس گمان کی بنا پر ان کا اتباع اختیار کر لیا کہ ایسے بڑے بڑے لوگ جب یہ کہتے ہیں اور باپ دادا ان کو مانتے چلے آ رہے ہیں اور ایک دنیا ان کی پیروی کر رہی ہے تو ضرور وہ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

[۲] "جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق ہے"، یعنی ابتدا سے جو اصولی تعلیمات انبیاء علیہم السلام کی معرفت انسان کو بھیجی جاتی رہی ہیں یہ قرآن اُن سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ انہی کی تصدیق و توثیق کر رہا ہے۔ اگر یہ کسی نئے مذہب کے بانی کی ذہنی اپج کا نتیجہ ہوتا تو اس میں ضرور یہ کوشش پائی جاتی کہ پرانی صداقتوں کے ساتھ کچھ اپنا نرالا رنگ بھی ملا کر اپنی شان امتیاز نمایاں کی جائے۔

(باقی صفحہ ۱۴۴ پر)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو "اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لیے بلا لو"۔[۱] اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا اس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اٹکل پچو) جھٹلا دیا۔[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳) "الکتاب کی تفصیل ہے" یعنی ان اصولی تعلیمات کو جو تمام کتب آسمانی کا لب لباب (الکتاب) ہیں، اس میں پھیلا کر دلائل و شواہد کے ساتھ، تلقین و تفہیم کے ساتھ، تشریح و توضیح کے ساتھ، اور عملی حالات پر انطباق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چیلنج محض قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے تھا۔ اعجاز قرآن پر جس انداز سے بحثیں کی گئی ہیں اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا مقام اس سے بلند تر ہے کہ وہ اپنی یکتائی و بے نظیری کے دعوے کی بنیاد محض اپنے لفظی محاسن پر رکھے۔ بلاشبہ قرآن اپنی زبان کے لحاظ سے بھی لاجواب ہے، مگر وہ اصل چیز جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسانی دماغ ایسی کتاب تصنیف نہیں کر سکتا، اس کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہیں۔ اس میں اعجاز کے جو جو پہلو ہیں اور جن وجوہ سے اس کا من جانب اللہ ہونا یقینی اور انسان کا ایسی تصنیف پر قادر ہونا غیر ممکن ہے ان کو خود قرآن میں مختلف مواقع پر بیان کر دیا گیا ہے اور ہم ایسے تمام مقامات کی تشریح پہلے بھی کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے اس لیے یہاں بخوف طوالت اس بحث سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

[۲] تکذیب یا تو اس بنیاد پر کی جا سکتی تھی کہ ان لوگوں کو اس کتاب کا ایک جعلی کتاب ہونا تحقیقی طور پر معلوم ہوتا یا پھر اس بنا پر کہ جو حقیقتیں اس میں بیان کی گئی ہیں اور جو خبریں اس میں دی گئی ہیں وہ غلط ثابت ہو جاتیں۔ لیکن ان دونوں وجوہ تکذیب میں سے کوئی وجہ بھی یہاں موجود نہیں۔ نہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ از روئے علم جانتا ہے کہ یہ کتاب گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کی گئی ہے، نہ کسی نے پردۂ غیب کے پیچھے جھانک کر یہ دیکھ لیا ہے کہ واقعی بہت سے خدا موجود ہیں اور یہ کتاب خواہ مخواہ ایک خدا کی خبر سنا رہی ہے یا فی الواقع خدا اور فرشتوں اور وحی وغیرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس کتاب میں خواہ مخواہ یہ افسانہ بنا لیا گیا ہے، نہ کسی نے مر کر یہ دیکھ لیا ہے کہ دوسری زندگی اور اس کے حساب کتاب اور جزا و سزا کی ساری خبریں جو اس کتاب میں دی گئی ہیں غلط ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نرے شک اور گمان کی بنیاد پر اس شان سے اس کی تکذیب کی جا رہی ہے کہ گویا علمی طور پر اس کے جعلی اور غلط ہونے کی تحقیق کر لی گئی ہے۔

موجودہ انتخابات اور جماعت اسلامی

از جناب محمد عنایت اللہ صاحب وارثی

کچھ دنوں سے اخبارات میں مولانا مودودی صاحب کے اس مضمون کا تذکرہ ہو رہا ہے جو ایک سوال کے جواب میں سہ روزہ "کوثر" مورخہ ۴ ؍ اکتوبر ۴۵ء کے صفحہ ۳ پر شائع ہوا ہے۔ مولانا نے انتخابات کی شرکت اور رائے دہی کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

"ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ نا ممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے ماتحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔"

دور حاضر کے علما حضرات، کانگریسی ہوں یا احراری، بریلوی ہوں یا دیوبندی، مختلف سیاسی نظریات رکھنے کے باوجود اسمبلیوں کے اشتراک و انسلاک میں متفق العمل ہیں۔ صاف انکار اور بائیکاٹ کی آواز پٹھان کوٹ کے سوا کہیں سے نہیں اٹھی اور وہ بھی اب تک محض ایک انکار ہے۔ ایک مسئلہ کی حیثیت سے یہ معاملہ تشنہ بحث ہے۔ سطور ذیل میں اجمالی طور پر اپنے تاثرات پیش کرتا ہوں، ممکن ہے

اہل علم اصحاب کی توجہ سے اس کے جزئیات دلیل و برہان کے ساتھ مزید روشنی میں آجائیں۔

اگر ممبران اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں۔ یعنی ان کو وہ اختیار حاصل ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں "آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے ماتحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔" کیونکہ آخر زمین کے منہ پر خدا کے بندوں ہی کو خدائی قانون کی ذمہ داری کو انجام دینا ہے۔ اگر حکم و اختیار نیک بندوں کے ہاتھ میں آئے گا تو یقیناً خدا کی زمین پر نیکی کی اشاعت ہوگی اور برائی مٹتی جائے گی۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔

لہٰذا اس مقصد اعلیٰ کے حاصل کرنے کے لیے ایجابی پہلو تو یہ ہوا کہ ایسے لوگوں کے منتخب ہونے کی کوشش کی جائے جن پر رضائے الٰہی کے ماتحت کام کرنے کا گمان غالب ہو، اور سلبی پہلو یہ رہا کہ ایسے لوگوں کے اختیار و اقتدار میں شدید مزاحمت کی جائے جن کی نسبت اس کے برعکس چلنے کا خیال ہو۔ علیحدگی بائیکاٹ اور تعطل کا جواز کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر نیک لوگوں کے برسر اقتدار آنے میں تعاون نہ کیا جائے تو تعاون علی البر کے خلاف ہے اور اگر خالی چھوڑ کر بروں کو موقع دیدیا جائے تو سکوت عن الحق کا جرم ثابت۔

ہاں اگر موجودہ جماعتوں میں کوئی جماعت تعاون کی مستحق اور اہل نہیں تو جماعت اسلامی کو میدان میں آنا چاہیے تاکہ یہ لوگ "اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہو اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہو۔" تاہم اس سارے زور کے لیے بائیکاٹ اور تجنب کا میدان تلاش کرنا یقیناً وضاحت طلب ہے۔

اگر ہر معاملہ کو وقتی قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کر دی جائے تو ایک ایسی دنیا مسلمانوں کے آباد ہونے کے لیے تلاش کرنی پڑے گی جو اس لیل و نہار اور وقت و زمان کی قیود سے ماورا ہو۔ نیز یہ بھی خیال کرنا پڑے گا کہ کیا اسلامی نظام کی ہمہ گیری اس سے قاصر ہے کہ وقتی مسائل کو اپنے ابدی

وا زلی قوانین کے ماتحت حل کر سکے۔ علیحدگی کسی صورت میں بھی اس مسئلہ کا حل نہیں کہلا سکتی۔ یا اس نظام کے ساتھ منع و مزاحمت کا معاملہ ہو یا قبول و اذعان کا تعلق۔ اگر پوری مزاحمت ناممکن بھی ہو تو بھی مسلمان حتی الامکان کام کرنے کے لیے مجبور ہے۔

اس سلسلہ میں اکثر اضطرار و اختیار کی بحث پیش آتی ہے۔ سو اس کی نسبت عرض ہے کہ محترم مولانا مودودی صاحب نے اپنی اکثر تحریروں میں اظہار افسوس کرتے ہوئے بالوضاحت لکھا ہے کہ بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں اسلامی قانون بغیر کسی منع و مزاحمت کے نافذ ہو۔ واقعی موجودہ حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے اور اس قانون و تمدن میں زندگی بسر کرتے ہوئے یہ بھی ناممکن کہ ہم اپنی تمام قوتوں اور مال و املاک کو نظام باطل کا آلۂ کار بننے سے محفوظ رکھ سکیں اور ہندوستان کے وسیع و عریض بر اعظم میں زمین کا ایک انچ بھر ٹکڑا ایسا تلاش کر سکیں جو اس نظام کے اثر سے ماؤف نہ ہو۔ تاہم گورداسپور کے ضلع میں قصبہ پٹھان کوٹ کے قریب زمین کے ایک ٹکڑے کو دارالاسلام بنایا جاتا ہے۔ اور اس شیطانی نظام کی تمام خرابیوں کے باوجود اس کے اندر وہ دارالاسلام ہے۔ اور یہ اسی مجبوری کا نتیجہ ہے کہ جو چیز مکمل حاصل نہ کی جا سکے اس میں سے جس قدر حاصل ہو سکے کر لی جائے۔

پھر مولانا نے دارالاسلام کے نظام کی توضیح فرماتے ہوئے اس سے رہبانیت اور قدامت پرستی کے شائبہ کو بھی رفع فرمایا ہے۔ لکھا ہے کہ دارالاسلام کے قیام کا مقصد اکثر غلط فہم پنڈتوں کی طرح یہ نہیں کہ تمدن وحضارت کی جو حالت صحابۂ کرام کے زمانہ میں تھی بالکل وہی پیدا کی جائے اور ایک متحجر صورت میں قائم رکھی جائے بلکہ آپ آیۂ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ سے استدلال کر کے قوانین طبعی کی ہر نئی قوت و ایجاد کو شرعی قانون کے ماتحت استعمال کرنا ہی عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرمایا ہے کہ:

"ریڈیو بجائے خود ناپاک نہیں، ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ڈائرکٹر کو دار وغۂ ارباب نشاط یا ناشر کذب و افترا بناتی ہے۔" رسالہ "دارالاسلام" صفحہ ۲

اور فرمایا کہ:۔

"یہ طاقتیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اس سے کام لے گا وہی کامیاب ہوگا، خواہ وہ ناپاک مقصد کے لیے کام لے یا پاک مقصد کے لیے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے مقصد کی پاکی کو لیے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے اور اس قصور کی سزا اسے بھگتنی پڑے گی، کیونکہ اس عالم اسباب میں خدا کی جو سنت ہے اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔" رسالہ مذکور صفحہ ۳

اب گذارش ہے کہ اسمبلی کی غیر مشروط قانون ساز قوت یا حکومت کے اختیار کی تلوار کا قبضہ اگر آپ جیسے صحیح الخیال اصحاب کے ہاتھ میں آنے کا موقع مل سکتا ہے تو اسے مسترد کر دینے اور اس سے امکانی فوائد حاصل کرنے سے باز رہنے کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ مزاحمت باطل اور اعلائے حق کی مصائب سے عمداً کنارہ کش ہو کر گوشہ عافیت اختیار کرنے کی یہ ایک دانشمندانہ کوشش تو نہیں۔

اگر پاک جماعت اپنے پاک مقاصد کو لیے بیٹھی رہے اور ناپاک مقاصد رکھنے والے لوگوں کے لیے عمداً جگہ چھوڑ دے اور نظام باطل کی گاڑی کے سامنے مزاحمت پیدا کرنے کی بجائے اس کے پہیے سے اپنے آپ کو بے حس و حرکت باندھ دینا ہی دینداری اور خدمت اسلام یقین کرلے تو کیا اس عالم اسباب میں خدا کی سنت کے مطابق اس قصور کی سزا بھگتنی نہیں پڑے گی؟

یا تو نظام باطل سے کامل بے تعلقی عملاً حاصل ہو جائے اور مسلمان ایک خالص اسلامی ماحول پیدا کرلے، لیکن اگر یہ صورت ناممکن ہو جیسا کہ ظاہر ہے تو پھر کونسا مسلک ہے کہ وہ تعاون تو اضطراراً جائز رکھا جائے جس سے یہ نظام کماحقہ متمتع ہو کر دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہو رہا ہے، اور ان صورتوں سے اختیاراً دستکشی کرلی جائے جہاں کسی قدر اسلامی مفاد بھی حاصل کرنا متصور ہو۔ اگر اسم اور مسمیٰ میں کسی وجہ تسمیہ کا ہونا لازم ہے تو ایسی روش کو مسلک (چلنے کی راہ) کے بجائے بقول "کوثر" موقف (ٹھہرنے کی جگہ) کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

"کوثر" کے اسی نمبر کے افتتاحیہ میں مولانا نصر اللہ خاں صاحب عزیز نے بھی اسی مسئلہ پر بحث فرمائی ہے جس کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں اور بھی الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور جمود و تعطل کا شائبہ یقین کی حد کو پہنچ جاتا ہے۔ آپ جہاد کے لیے دو شرطیں مقرر فرماتے ہیں۔ لکھا ہے:-

"اس کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ با اختیار امیر کی قیادت میں ہو۔ کسی دوسرے نظام قاہر و مسلط کے اندر رہتے ہوئے جہاں کسی با اختیار امیر کا وجود ناممکن ہے قتال کرنا بدامنی اور فساد ہے جو جائز نہیں۔"

یہ حکم مزید توضیح کا محتاج نہیں۔ با اختیار امیر کی قیادت کے بغیر جہاد فساد ہے اور امیر کا وجود کسی دوسرے قاہر و مسلط نظام کی موجودگی میں ناممکن ہے۔[۵]

اس شرط کی صحت تسلیم کر لینے کے بعد نظام حقہ قائم ہونے کی صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ قاہر و مسلط نظام کے ارکان خود بخود مہربانی کر کے مسلمانوں پر سے اپنا قہر و تسلط اٹھا لیں اور انھیں کامل آزاد ماحول میں چھوڑ کر ٹھنڈے ٹھنڈے کہیں سدھار جائیں تاکہ مسلمانوں کو ایک با اختیار قیادت قائم کرنے کا شرعی حق حاصل ہو جائے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ پھر جہاد کی ضرورت رہے یا نہ رہے۔ بہر حال جہاد حلال ہونے کی شرط یہی ہے۔

اگر یہ شرعی فتوی کسی غیر متقی کو مشتبہ نظر آئے تو پھر سوا اس کے چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ جس طرح نظام باطل کے منع و مزاحمت کے باوجود ایک غیر اسلامی ماحول میں دارالاسلام قائم کرنے کی کوشش مناسب و موزوں بلکہ ضروری نظر آتی ہے اور اس نظام کے پیدا کردہ تمام آلات و قوئی سے کام لینا عین اسلام اور کام نہ لینا ہلاکت قرار دیا جاتا ہے، وہاں اسمبلیوں سے اپنا حصہ حاصل کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہی تقاضائے عقل و انصاف ہے۔

مسلم لیگ کی پیدا کردہ موجودہ فضا اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اگر دیہات کے ناخواندہ زمینداروں کے سامنے جو آج تک ذات پات کی عصبیت میں اعراب عرب سے کسی حالت میں کم نہیں تھے ایک طرف کوئی غیر متشرع نواب ہوتا اور دوسری طرف ایک عالم دین تو یقیناً وہ عالم دین کو کامیاب کر کے چھوڑتے۔ اس نادر موقع سے فائدہ نہ اٹھانے اور عوام کو مذہبی قیادت سے محروم رکھنے کی ذمہ داری

---

[۵] ترجمان القرآن:- یہ محض ایک غلط بحث ہے۔ مدیر کوثر نے اس موقع پر جس جہاد سے بحث کی ہے وہ جہاد بالسیف ہے، وہ جہاد جو جد و جہد کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے جہاد کے لیے با اختیار امیر کی شرط کا کوئی بھی قائل نہیں۔

صرف ان لوگوں پر ہے جو محض اپنے آرام کی خاطر علما کو بائیکاٹ کا مشورہ دے رہے ہیں۔

یوسف صدیق علیہ السلام نے اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ کا مطالبہ کر کے غیر اسلامی حکومت کے ایک شعبہ کو ہاتھ میں لیا اور بہترین انتظام کر کے دنیا کو ہلاکت سے بچایا۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ اور اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کے مسلسل مطالبات کر کے ایک غیر مہذب اور غیر صالح بھیڑ کو اسی ملک کے ایک حصہ میں رکھ کر اصلاح و تہذیب کی کوشش کی۔

مریض کی صحت انھیں اخلاط کی تبدیلی پر منحصر ہے جو مریض کے وجود کے اندر موجود ہیں۔ ہمسایہ کے گھر میں خواہ کسی قدر بہترین اور قیمتی ادویات کا انبار عمدہ سے عمدہ قرینہ اور ترتیب ہی سے کیوں نہ لگا دیا جائے دوسرے گھر والا مریض صحت یاب نہیں ہو سکتا۔

جواب

یہ مضمون دراصل متعدد مغالطوں یا غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر کے یہاں ہم صرف تین بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) صاحبِ مضمون کی پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ "اگر ممبرانِ اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں یعنی ان کو اختیار حاصل ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے"۔۔۔۔ بظاہر یہ بات بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی تھوڑی سی تحلیل کرنے سے ہی یہ حقیقت بآسانی کھل جاتی ہے کہ یہ مغالطہ یا غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آزادی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان کو یا انسانوں کے کسی گروہ کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہو اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ اپنا یہ اصول قرار دے اور اس نظریے پر کاربند ہو کر وہ اپنے عمل میں خود مختار رہے اور خود اپنی خواہش اور صوابدید کے سوا کسی آسمانی ہدایت سے امر و نہی

کے احکام لینے اور اپنے معاملات میں رہنمائی حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے۔ ان دونوں مفہومات میں سے پہلے مفہوم کی آزادی تو انسان کی فطری مسئولیت و ذمہ داری کی اساس ہے جس کی بنیاد ہی پر وہ شرائع الٰہیہ کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ یہ آزادی مومن ہونے کے لیے بھی اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح کافر ہونے کے لیے۔ اسے ایمان و اسلام کی راہ میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کفر و معصیت کی راہ میں بھی۔ اس کو بجائے خود نہ کفر کہا جا سکتا ہے نہ ایمان، بلکہ یہ ایک شرط مقدم ہے جس کے حصول کے بغیر کوئی فرد یا گروہ نہ ایمان کی راہ پر چل سکتا ہے نہ کفر کی راہ پر۔ بخلاف اس کے دوسری قسم کی آزادی قطعی طور پر ایک کافرانہ آزادی ہے اور کسی فرد یا قوم کا اسے بطور ایک نظریہ و مسلک کے اختیار کرنا صریحاً یہ معنی رکھتا ہے کہ اس نے ایمان کے بجائے کفر کی راہ اپنے لیے انتخاب کی ہے، کیونکہ کفر اس کے سوا کسی اور چیز کا نام ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہدایت الٰہی سے بے نیاز قرار دے کر اپنے نظریات و اعمال میں خود مختاری کا طریقہ اختیار کرے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں جس دستور پر حکومت خود اختیاری کا نظام اس وقت قائم کیا گیا ہے اور جن خطوط پر آئندہ اس دستور کا نشو و نما ہو رہا ہے، اس کی بنیاد آیا محض پہلی ہی قسم کی آزادی ہے یا دوسری قسم کی آزادی بھی اس میں شامل ہے؟ جو شخص یہاں کے موجودہ نظام حکومت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ پورا نظام دنیوی لادینی ریاست (Secular State) کے نظریہ پر مبنی ہے اور اب جو اس کا مزید دستوری ارتقا ہو رہا ہے اس میں بھی یہ بات اصل و اساس کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ اسی دنیوی لادینی ریاست کے قاعدہ پر مبنی ہوگا۔ یعنی اس میں باشندگان ملک کو صرف یہی آزادی حاصل نہیں ہوگی کہ اپنے لیے جو دستور چاہیں اختیار کریں، بلکہ اس کی بنیاد لازماً اس نظریہ پر قائم ہوگی (اور آج بھی ہے) کہ حاکمیت جمہور کی ہے اور قانون سازی میں رائے عام سے بالاتر کسی کتاب الٰہی اور ہدایت خداوندی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بنا پر یہ پورا نظام دراصل ایک کافرانہ نظام ہے، اس کی بنیاد اسلام کی بنیاد سے متصادم ہے اور اس کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں داخل ہونا قطعاً ایمان کے خلاف ہے۔ یہ آواز اگر صرف "پٹھان کوٹ" سے اٹھی ہے تو اس میں بیچارے "پٹھان کوٹ"

کا کوئی قصور نہیں، قصور ان دوسری جگہوں کا ہے جہاں سے یہ اٹھنی چاہیے تھی مگر نہ اٹھی۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم اس نظام کے اندر داخل ہو کر[۱] اس کو اسلام کی طرف پھیر لیں گے۔ اس کے اندر داخل ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ پہلے اس کے بنیادی نظریے کو تسلیم کیا جائے، اور اس کے بنیادی نظریے کو تسلیم کرنا اسلام کے بنیادی نظریے سے انکار کا ہم معنی ہے، لہٰذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ باہر رہ[۲] کر اس کے خلاف لڑیں اور اپنی تمام تر کوشش پہلے یہ اصول منوانے میں صرف کریں کہ قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے نہ کہ اس سے آزاد، اور باشندگان ملک کی حکومت خود اختیاری دوسری قوموں اور ملکوں کے مقابلہ میں خود اختیاری ہونی چاہیے، نہ کہ خدا کے مقابلہ میں! اصولی حیثیت سے قطع نظر عملی حیثیت سے بھی یہ تدبیر قطعاً ایک غلط تدبیر ہے کہ اس کافرانہ نظام حکومت کی مجالس قانون ساز میں داخل ہو کر ہم مذکورۂ بالا اصول منوانے کی کوشش کریں۔ یہ پارلیمنٹری طریق کار صرف ان جماعتوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے جو اصول میں رائج الوقت نظام سے متفق ہوں اور صرف فروعی اصلاحات کے معاملہ میں اپنا الگ مسلک رکھتی ہوں۔ لیکن جو جماعت سرے سے اس نظام ہی کو اصولی طور پر بدل ڈالنا چاہتی ہو اس کے لیے پارلیمنٹری طریق کار کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کو تو لازماً انقلابی طریق کار اختیار کرنا پڑتا ہے یعنی یہ کہ وہ رائج الوقت نظام کے خلاف عام بے چینی پیدا کرے اور اس کو بدلنے کا ایک زبردست داعیہ باشندگان ملک میں ابھار دے، پھر وقت کے حالات کے لحاظ سے ایسی تدبیر اختیار کرے جس سے نظام حکومت عملاً تبدیل ہو سکے۔

(۲) دوسری غلط فہمی جس میں صاحب مضمون مبتلا ہیں، یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس نظام کی اصلاح اس طرح اور صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اچھے لوگوں کو منتخب کر کے اُن اسمبلیوں میں بھیجنے کی کوشش کی جائے جو اس کافرانہ دستور پر بنائی گئی ہیں، اور چونکہ جماعت اسلامی نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا ہے

---

[۱] یعنی اس کی کار فرمائی و کارکنی میں شریک و حصہ دار بن کر۔

[۲] باہر رہنے سے ہماری مراد حکومت کی مشینری سے باہر رہنا ہے، نہ کہ اس تمدن سے باہر نکل جانا جو اس حکومت کے تحت چل رہا ہے۔

اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ اس جماعت نے محض علیحدگی و اجتناب کا سلبی پہلو اختیار کر رکھا ہے جس سے اصلاح تو کسی طرح نہ ہوگی البتہ اقتدار کی تلوار برے لوگوں کے ہاتھ میں جا کر باطل کے اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ جمانے میں استعمال ہوگی۔ اس غلط فہمی میں نہ صرف صاحب مضمون مبتلا ہیں، بلکہ بکثرت لوگ اسی طرز پر سوچ رہے ہیں اور اس کی اصل وجہ سطح بینی اور قلت فکر و تدبر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دراصل یہ حضرات اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کروڑوں مسلمانوں کے موجود ہوتے ہوئے موجودہ کافرانہ نظام اس ملک میں آخر قائم کیسے ہو گیا اور کیا وجہ ہے کہ ملک کا سارا دستوری ارتقا انہی کافرانہ اصولوں پر ہوتے چلا جا رہا ہے۔ اس سوال پر اگر انھوں نے کچھ غور کیا ہوتا تو ان پر خود یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ اس خرابی کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً شعور اسلامی مردہ یا نیم مردہ ہو گیا ہے۔ ان کے اندر اسلامی دستور حیات پر اداماس کے لیے جینے اور مرنے کا ارادہ مفقود یا فقدان کی حد تک ضعیف ہے، اور انھوں نے ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں کو بھی صحیح نظام زندگی سمجھانے اور اس کی طرف دعوت دینے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کی اپنی زندگی بھی فکری، اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بیشتر غیر اسلامی ہو گئی ہے اور ہندوستان کا پورا نظام تمدن و سیاست بھی کافرانہ اصولوں پر قائم ہوا ہے۔ اب اس خرابی کا اور اس کے برے نتائج کا مداوا کرنے کے لیے اس قسم کی تدابیر سے کچھ کام نہیں چل سکتا کہ اس کافرانہ نظام کی مشینری میں ہم چند نیک مومنوں کو بھجوانے کی کوشش کریں۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر اس اصولی سوال کو نظر انداز کر بھی دیا جائے کہ ایک نیک مومن اس مشینری کی کافرانہ بنیادوں کو تسلیم کر کے اس میں داخل ہونے پر آمادہ ہی کیسے ہو سکتا ہے، اور اگر تقیہ کے شیعی طریقہ کو اختیار کر کے چند مومن اس نظام میں داخل ہونے پر آمادہ ہو بھی جائیں، تو دیکھنا یہ ہے کہ اس تدبیر سے حاصل کیا ہو سکتا ہے:

جمہوری نظام میں کوئی گروہ اپنے اصول کے مطابق نظام حکومت کو اس وقت تک ہرگز نہیں چلا سکتا جب تک کہ وہ حکومت کی مشینری پر قابض نہ ہو۔

حکومت کی مشینری پر قابض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مجالس قانون ساز میں اس کو غالب

اکثریت حاصل ہو۔

اس غالب اکثریت کا حصول بحالات موجودہ ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں اہل ایمان کے لیے ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس وقت اسلام اس ملک میں ایک ایسی اصولی تحریک کی حیثیت نہیں رکھتا جس کے علمبردار باشندگان ملک سے محض اپنے اصولوں کی بنا پر عام اپیل کر سکتے ہوں اور یہ امید کی جا سکے کہ وہ اپنی دعوت کو مقبول عام بنا کر اکثریت کی تائید حاصل کرلیں گے۔ فی الحال تو اسلام ہندوستان کی ایک ایسی قوم کا مذہب ہے جس کی دوسری قوموں سے کشمکش ہو رہی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی گروہ اس وقت خالص اسلامی اصول سے کر انتخابی مقابلہ میں اترے گا تو مسلمان قومیت کے پرستاروں کی طرح اس کو بھی صرف موجودہ مسلمان قوم ہی کے ووٹوں پر انحصار کرنا پڑے گا، اور معلوم ہے کہ یہ قوم ملک کے بڑے حصہ میں بجائے خود اقلیت میں ہے۔

رہے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے، تو اگر بالفرض وہ پاکستان کی صورت میں خود مختار ہو جائیں اور ایک مستقل صاحب حاکمیت اسٹیٹ کی حیثیت بھی ان کو حاصل ہو جائے تب بھی خالص اسلامی اصولوں پر جو گروہ کام کرنا چاہتا ہو اس کے غالب اکثریت حاصل کرنے کا بحالت موجودہ یہاں بھی کوئی امکان نہیں ہے، کیونکہ اس کے اکثریت حاصل کرنے کا تمام تر انحصار مسلمانوں کی رائے عام پر ہے اور مسلمانوں کی رائے عام اس وقت بالکل ناتربیت یافتہ ہے، اسلامی فہم و شعور سے بہت بڑی حد تک عاری ہے اور اسلامی مقاصد کی بہ نسبت اپنی دنیوی خواہشات و اغراض کے عشق میں بری طرح مبتلا ہے۔ اس رائے عام کی تائید سے کسی ایسے گروہ کا اکثریت کے ساتھ منتخب ہو نا تقریباً ناممکن ہے جو بے لاگ طریقہ سے خالص اسلامی اصولوں پر کام کرنا چاہتا ہو۔

پھر اگر بالفرض ایسا ایک گروہ اکثریت میں منتخب ہو بھی جائے تو جو حالات اس وقت پائے جاتے ہیں ان میں یہ ممکن نہیں ہے کہ آزاد پاکستان کے نظام کو اسلامی دستور میں تبدیل کیا جا سکے کیونکہ جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں، لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم

اسی طرح برابر کے شریک حکومت ہوں گے جس طرح مسلمان۔ اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم ہو اور ان کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہوگی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے۔

ہم ان حقائق کو سمجھتے ہیں اور اس بنا پر ہمارے نزدیک وہ تدابیر بالکل لاحاصل ہیں جن سے ہمارے محترم مضمون نگار اور ان کے طرز پر سوچنے والے بہت سے مسلمان اسلامی نظام کے قیام کی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مقصد تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کا سیاسی نظام جس ڈھنگ پر چل رہا ہے اور جس راہ پر وہ آگے بڑھتا نظر آرہا ہے اس سے فی الحال ہم قطع نظر کرلیں اور اپنی ساری قوت اُس بنیادی کام پر صرف کریں جس کے ذریعہ سے نظام زندگی میں اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی جو جماعتیں حقیقی صورت معاملہ کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہی ہیں وہ اپنے طرز عمل میں آزاد ہیں، جس طرح وہ کام کرنا چاہیں کریں، ہم ان کے خلاف خواہ مخواہ کوئی معرکہ آرائی نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ پچھلے زمانہ کی غلطیوں کی بدولت اس وقت فوری طور پر ایسی کوئی قوت فراہم نہیں کی جاسکتی جس سے واقعات کی موجودہ رفتار پر وہ کم سے کم اثر بھی ڈالا جاسکے جو اسلام کے مقصد کے لیے مطلوب ہے، اس لیے ہم اس وقت کی سیاسی کارروائیوں میں دخل دینا تضیع وقت بھی سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے بھی اس سے احتراز کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہم اپنے اصول سے ہٹے بغیر سیاسی جدوجہد میں حصہ نہیں لے سکتے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت سیاسی معاملات کا فیصلہ خواہ کچھ ہی ہو جائے اور اس کے نتائج آگے چل کر خواہ کتنے ہی خوفناک نکلتے نظر آئیں، لیکن اگر ہم اُس پروگرام پر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد کرنے میں کامیاب ہوگئے جو ہمارے پیش نظر ہے تو واقعات کی رفتار بالآخر پلٹ کر رہے گی اور ان سارے نقصانات کی تلافی ہو جائے گی جو اس وقت کے اجتناب سے ہمیں پہنچیں گے۔

ہمارا پروگرام مختصراً یہ ہے:

۱۔ مسلمانوں کے اس مخلوط انبوہ میں سے صالح اہل ایمان کے عنصر کو چھانٹ کر اعلیٰ درجہ کی اخلاق

تربیت کے ساتھ منظم کیا جائے اور ان کو اس کام کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ مسلم قومیت کے بجائے خود اسلام کو ایک اصولی تحریک کی حیثیت سے لے کر اٹھ سکیں۔

ب۔ اس گروہ کے ذریعے عامۂ مسلمین میں اسلامی شعور و فہم اور اسلام اور غیر اسلام کی تمیز پیدا کی جائے۔ ان کی اخلاقی قدروں کو تبدیل کر کے خالص اسلامی قدریں ان کے ذہن نشین کی جائیں۔ ان میں اسلامی نظام زندگی کے قیام کا مضبوط ارادہ (موہوم اور مبہم ارادہ نہیں بلکہ واضح اور شعوری ارادہ) پیدا کیا جائے اور ان کی رائے عام کو اس حد تک تیار کر دیا جائے کہ اگر جمہوری طریقوں پر ملک میں انقلاب کرنا ممکن ہو تو خالص اسلامی طرز پر کام کرنے والی جماعت کے سوا کوئی دوسرا گروہ انھیں بے وقوف بنا کر یا ان کے سامنے غیر اسلامی مقاصد پیش کر کے ان سے ووٹ نہ حاصل کر سکے۔ اور اگر جمہوری طریقے قابل عمل نہ ہوں تو وہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو جائیں۔

ج۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی موجودہ سیاسی کشمکش سے جو تعصبات ہندوستان کے غیر مسلموں میں پیدا ہو گئے ہیں ان سے بالاتر ہو کر غیر مسلموں کے سامنے اسلامی نظام زندگی اور ان اخلاقی بنیادوں کو جن پر یہ نظام زندگی قائم ہوتا ہے پیش کیا جائے اور پوری حکمت، جانفشانی اور خالص للّٰہیت کے ساتھ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں یہ ممکن ہو کہ غیر مسلموں کا بھی ایک صالح عنصر اسلامی نظام زندگی کا معتقد اور اس کے قیام کا طالب ہو جائے اور اسلامی نظام کا قیام صرف موجودہ مسلمان قوم کی رائے عام پر منحصر نہ رہے بلکہ ان قوموں کی رائے عام بھی اس کی مؤید ہو جائے جو آج غیر مسلم ہیں اور جن کو مسلمانوں کی موجودہ قومیت پرستانہ جنگ نے اسلام کے خلاف سخت تعصبات میں مبتلا کر رکھا ہے۔

اس پروگرام میں جب ہم ایک قابل لحاظ حد تک کامیاب ہو جائیں گے (اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرز پر ہم کام کر رہے ہیں اس سے آخر کار ان شاء اللہ ہم کو کامیابی ضرور ہوگی) تب ہم ملک کے حالات پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ آیا اس وقت یہاں جمہوریت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ دستور حکومت میں کوئی اصولی تغیر صرف اس بنیاد پر ہو سکتا ہے کہ رائے عام اس تغیر کی خواہشمند ہے؟ اگر صورت

ہم نے موجود پائی تو ہم وقت کے دستورِ حکومت کو تبدیل کرنے اور اسلامی اصول پر نیا دستور بنانے کا مطالبہ ملک کی رائے عام کے سامنے پیش کریں گے۔ اس تغیر کے لیے اسے تیار کریں گے اور وقت کے سیاسی نظام پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی (Constituent Assembly) منعقد کرے جو اس امر کا فیصلہ کرے کہ ملک کا آئندہ دستور کیا ہو۔ اس اسمبلی کے الیکشن میں ہم پوری کوشش کریں گے کہ رائے عام کی تائید سے ہم کو اکثریت حاصل ہو اور ہم ملک کا دستور اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس پروگرام کو ایک بڑا لمبا پروگرام سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید اس کے پورا ہونے میں دو تین صدیاں لگ جائیں گی، اس لیے ان کے نزدیک یہ کوئی عملی پروگرام نہیں ہے بلکہ وہ اسے ایک خیالی پلاؤ سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پروگرام میں سارا دیر طلب کام صرف اس ابتدائی صالح گروہ کی تنظیم و تربیت کا ہے جو اسلامی انقلاب کی ایک وسیع تحریک کا موزوں محرک ہو سکے۔ ایسے ایک گروہ کی تنظیم کے بعد یہ تحریک اس طرح پھیلے گی جیسے خشک گھاس میں آگ پھیلتی ہے۔ وقت کے تعین کی پیشینگوئی تو میں نہیں کر سکتا۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس ابتدائی مرحلہ کے گزرنے کے بعد ہماری منزلِ مقصود اتنی دور نہیں رہے گی جتنی بہت سے لوگ کام کیے بغیر صرف اپنے خیال میں دور سمجھ رہے ہیں۔ تاہم اگر یہ دور بھی ہو تو چونکہ منزلِ حق یہی ہے اس لیے ہم اس کی طرف دوڑتے ہوئے مر جانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں، بہ نسبت اس کے کہ جانتے بوجھتے غلط مگر آسان راہوں میں اپنی قوت صرف کریں یا نادانی کے ساتھ جنت الحمقاء کے حصول میں اپنی قوت ضائع کریں۔

(۳) تیسری غلط فہمی جس میں صاحب[illegible]ین کے ساتھ بہت سے سادہ لوح مسلمان مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کردہ موجودہ فضا اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ عام مسلمانوں کے ووٹوں سے [illegible] کا ایسا گروہ منتخب ہو کر آ سکتا ہے جو وقت کی سیاسی رفتار کو اسلامی نصب العین کی طرف پھیرنے کے قابل ہو۔ اسی بنا پر یہ حضرات کہتے ہیں کیسا نادر موقع مل رہا ہے اور تم اسے کھوئے دیتے ہو۔ اندھے ایمان کی بات تو دوسری ہے کہ اس میں تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور جب کوئی تحریک شور و غل اور ہنگامہ کے ساتھ طوفانی رفتار سے چل رہی ہو تو عام طبائع میں اندھے ایمان کا رجحان پیدا ہو ہی جایا کرتا ہے

لیکن جب ہم تحقیق کی نگاہ ڈال کر اس فضا کا جائزہ لیتے ہیں جو مسلم لیگ نے پیدا کی ہے تو ہمیں کسی نادر نو درکنار غیر نادر موقع کا بھی نشان نہیں ملتا۔

مسلم لیگ کی تحریک کے متعلق پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ اس کے بنیادی تصورات، اس کا نظام ترکیبی، اس کا مزاج اور اس کی اسپرٹ، اس کا طریق کار اور اس کے مقاصد سب کچھ وہی ہیں جو قومی اور قوم پرستانہ تحریکوں کے ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے اور مسلمان کی ہر چیز "اسلامی" بن جایا کرتی ہے، اس لیے خواہ مخواہ اسے بھی اسلامی تحریک سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسری ہی چیز ہے جس کا کوئی شائبہ بھی مسلم لیگ کی قومی تحریک میں نہیں پایا جاتا، اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسلام اپنے مخصوص طریق کار سے جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے اس تک آپ ایک قوم پرستانہ تحریک کے ڈھنگ اختیار کر کے پہنچ جائیں۔ ہر منزل اپنی فطرت کے لحاظ سے اپنی ہی ایک مخصوص راہ رکھتی ہے۔ آپ اسلام کی منزل مقصود کو پہنچنا چاہیں تو آپ کو اسلامی تحریک ہی کی مخصوص راہ کو سمجھنا اور اسے اختیار کرنا پڑے گا۔ قوم پرستی کے طریقے اختیار کر کے آپ قومیت کی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں مگر یہ توقع کرنا انتہائی پراگندہ خیالی ہے کہ ان ڈھنگوں سے آپ اسلامی منزل مقصود پر جا پہنچیں گے۔ اس نکتہ کی توضیح کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" میں تفصیل کے ساتھ یہ بتا چکا ہوں کہ ایک اصولی تحریک اور ایک قوم پرستانہ تحریک میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ضرورت ہو تو پھر اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔ یہاں میں اشارۃً صرف اتنی بات واضح کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک اصولی تحریک کے کارکنوں کو یہ خبر دینا کہ تمہارے لیے ایک قوم پرستانہ تحریک نے بڑے اچھے مواقع پیدا کر دیے ہیں کسی بصیرت اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں ہے۔ اس کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کسی عازم کلکتہ کو یہ خبر دی جائے کہ کراچی میل تیار کھڑا ہے۔

ان کی یہ خوشخبری کسی حد تک اگر صحیح ہو بھی سکتی تھی تو شاید اس صورت میں ہوتی جبکہ مسلمانوں کی اس قوم پرستانہ تحریک میں کم از کم ثانوی حیثیت ہی سے مذہبیت کا پر زور اثر موجود ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں اس کا بھی فقدان ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ فی الواقع مسلمانوں کو اسلام اور

اس کی تہذیب اور اس کے احکام کی اطاعت سے روز بروز دور تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے اس میں اسلام کا نام بہت لیا جاتا ہے۔ ابتدائی نمائشی باتیں بھی کچھ کر دی جاتی ہیں جن سے اکابر لیگ کے گہرے جذبۂ دینی کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔ لیکن یہ چیزیں صرف سطح ہی میں لوگوں کو دھوکے میں ڈال سکتی ہیں۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ ہر صاحب نظر کے سامنے بالکل بے نقاب ہے۔ لیگ کی قیادت، اس کی پالیسی کی تشکیل، اس کے پورے نظام کی کار فرمائی، اور اس کی ساری قوتِ محرکہ اس وقت مسلمان قوم کے ایک ایسے طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو زندگی کے جملہ مسائل میں دینی کے بجائے دنیوی (Secular) نقطۂ نظر سے سوچنے اور کام کرنے والا ہے، اسلام کے بجائے مغربی اصول حیات کا معتقد اور مقلد ہے۔ دینی تعلق کے بجائے قومیت کے تعلق کی بنا پر مسلمانوں کی حمایت و وکالت اسی طرح کر رہا ہے جس طرح ہر قوم کے قوم پرست کیا کرتے ہیں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ گروہ خود علانیہ اسلام کے اصول و احکام کی خلاف ورزی کرنے میں بیباک ہے بلکہ اس کی رہنمائی و سربراہ کاری کی وجہ سے مسلمانوں میں بالعموم اسلام کے احکام کی خلاف ورزی اور اس خلاف ورزی میں بیباکی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کی دینی حس مردہ ہو رہی ہے اور اُن پر ذہنیت بڑی تیزی کے ساتھ چھا رہی ہے جو اپنی اصل کے لحاظ سے قطعاً ایک دنیا پرستانہ ذہنیت ہے مگر "مسلم قوم کے مفاد" اور "ملت کی زندگی کے بقا" کا نام لے لے کر اس پر "اسلامیت" کا جھوٹا ملمع چڑھایا جا رہا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس صورت حال کے پیدا کرنے کی ذمہ داری میں اُن مذہبی رہنماؤں کی نادانی بھی برابر کی شریک ہے جن کے ہاتھ میں تحریک خلافت کے زمانہ سے مسلمانوں کی قیادت کی باگیں تھیں اور جنھوں نے مسلمانوں کے عام احساسات کے علی الرغم ہندوستانی قوم پرستی کے سراسر غلط مسلک پر اصرار کر کے مسلمانوں کو زبردستی لامذہب رہنماؤں کی گود میں دھکیل دیا۔ لیکن اسباب خواہ کچھ ہوں، یہ واقعہ بجائے خود واقعہ ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کی ہوئی موجودہ فضا اسلام کے لیے کوئی موافق فضا نہیں ہے بلکہ انتہائی ناموافق اور ناسازگار فضا ہے جس میں خالص دینی نقطۂ نظر سے کام کرنے کے مواقع کم اور کم تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ لیگ کے حلقہ میں ایسے لوگوں کا بھی ایک بہت بڑا گروہ شامل ہے جو اخلاص کے

ساتھ مسلمان ہیں اور سچے دل سے اسلام کی برتری چاہتے ہیں۔ مگر مجھے ان کی سادہ لوحی پر بڑا ترس آتا ہے یہ بیچارے اسی نادانی کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کا ارتکاب ٹرکی کے بہت سے نیک نیت مسلمانوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد کیا تھا اور اس کا برا انجام دیکھ لیا۔ انھوں نے بھی اسی طرح قومی تحفظ کی خاطر (اور "مسلمان ترک" کا تحفظ تو ایک مقدس مذہبی کام بن ہی جاتا ہے) مصطفیٰ کمال اور اس کی قوم پرست پارٹی کو زمام کار سونپی تھی۔ وہ بھی اسی طرح مذہبی تاویلیں کر کر کے لادینی کی طرف اس کی ہر پیشقدمی کو گوارا کرتے رہے، اور یونہی وہ بھی اپنا دل یہ سوچ سوچ کر بہلایا کرتے تھے کہ اس وقت تو قوم کا تحفظ مقدم ہے اور اس کے لیے اللہ اپنے دین کی تائید اس رجل فاجر کے ذریعہ کر رہا ہے جب یہ وقت گذر جائے گا تو ان شاء اللہ ہمارا کاروان جادۂ اسلام کی طرف پھر مڑ جائے گا۔ مگر جو کارواں اپنے آپ کو بے دین قیادت کے قابو میں خود دے چکا تھا اسے پھر اسلام کی راہ پر جادہ پیمائی کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔

اب ذرا دینی پہلو سے قطع نظر کر کے محض قومیت کے نقطۂ نظر سے اس فضا کا جائزہ لیجیے جو مسلم لیگ نے اس وقت پیدا کی ہے۔ اس کا یہ پہلو خواہ کتنا ہی شاندار ہو کہ مسلمانوں میں ایک عام قومی حرکت پیدا ہو گئی ہے اور وہ ایک مرکزی طاقت سے بظاہر وابستہ ہو گئے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لیگ کی یہ تحریک محض ایک اضطراری ہیجان ہے جو ہندو قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے خوف سے مسلمانوں میں بھڑک اٹھا ہے۔ اس ہیجان کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا نقشہ نہیں ہے، کوئی واضح مقصد[1] نہیں ہے۔ کوئی تعمیری سعی نہیں ہے جو حصول مقصد کے لیے طاقت فراہم کر سکے، کوئی ایسی کارکن جماعت نہیں ہے جو قابل اعتماد سیرت اور ایک منظم فکر رکھتی ہو اور کوئی ایسی قیادت نہیں ہے جو ایک عمومی تحریک کو چلانے کی اہل ہو۔ فی الواقع مسلمانوں میں جو حرکت پیدا ہوئی ہے وہ لیگ اور اس کی قیادت نے سوچ سمجھ

[1] کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان ایک واضح مقصد ہے۔ لیکن کسی مقصد کے لیے محض ایک نام مہیا ہو جانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ مقصد ایک واضح مقصد ہے۔ جس چیز کو پاکستان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ قطعی مبہم ہے اور اس کی اصلی تعبیر غالباً ایک جمہوری لادینی اسٹیٹ کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ مگر اس کو محض اس لیے صاف صاف بیان نہیں کیا جاتا کہ سادہ لوح مسلمان جو اسلامی نظام کے قیام کی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں، ابھی مایوس نہ ہو جائیں۔

کسی نقشہ کے مطابق پیدا نہیں کی بلکہ ہندوؤں کے قومی امپیریلزم اور ان کے لیڈروں کی تنگ دلانہ سیاست سے مسلمانوں میں خود بخود ایک احساس خطر اور ہیجانِ اضطراب بھڑک اٹھا اور اس حالت میں جب مسلمانوں نے دیکھا کہ ان کے وہ مذہبی اور سیاسی لیڈر جن کی طرف وہ تحریک خلافت کے زمانہ سے رجوع کرتے رہے تھے، ان کے کسی کام نہیں آرہے تو جس نے بھی آگے بڑھ کر ان کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھایا اس کا دامن انھوں نے تھام لیا۔ اب یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اس ہیجان کی حالت میں جو رہنمائی ان کو میسر آئی وہ بجز کانفرنسوں اور اسمبلیوں کی لڑائی لڑنے کے اور کسی طرزِ جنگ اور طریق تیاری سے واقف نہیں ہے۔ پچھلے آٹھ سال میں اس قیادت نے اس خود بخود ابھرنے والے ہیجان سے فائدہ اٹھا کر ہر دلعزیزی تو ضرور حاصل کی، لیکن اس ہر دلعزیزی سے جو طاقت اس کو ملی تھی اس سے کوئی تعمیری کام نہ کیا، مسلمانوں کی قومی طاقت کو بنانے کے لیے جو تدبیریں ممکن تھیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور کارکنوں اور رہنماؤں کا کوئی گروہ ایسا تیار نہیں کیا جو قومی حیثیت ہی سے سہی، کچھ اخلاقی بلندی اور کچھ قابلِ اعتماد سیرت کا حامل ہوتا۔ کئی قیمتی سال اس نے محض وزارتوں کا کھیل کھیلنے میں ضائع کر دیے اور یہ کھیل چونکہ کسی تیاری اور کسی نقشہ کے بغیر کھیلا گیا تھا اس لیے اس کا کوئی فائدہ اس کے سوا نہ ہوا کہ مسلمانوں کے قومی کیرکٹر کی کمزوری اور زیادہ بے نقاب ہو گئی اور ان کی ہوا پہلے سے زیادہ اکھڑ گئی۔ پھر اب جو فیصلہ کا وقت آیا اور نئے انتخابات شروع ہوئے تو چونکہ پہلے سے کوئی تیاری نہ تھی اس لیے پھر مسلمانوں کے وقتی واضطراری ہیجان ہی پر اعتماد کرنا پڑا، اور نہایت سراسیمگی کی حالت میں ہر اس شخص اور گروہ کو جو اس وقت فوری طور پر کار آمد ہو سکے، استعمال کیا جانے لگا، قطع نظر اس سے کہ وہ کیسا ہی خود غرض، منافق، مطلبی اور بدکردار ہو اور آگے چل کر مسلمانوں کے لیے کتنا ہی نقصان دہ ثابت ہونے والا ہو۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی صورت حال نظر آرہی ہے کہ جس طرح ایک سیلاب سے بھاگ کر انسان، جانور، درندے، سانپ، بچھو، سب ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں، اسی طرح کانگریس کا نقاب اوڑھے ہوئے جو ہندو امپیریلزم سیلاب کی طرح بڑھا چلا آرہا ہے اس کے خوف سے عام مسلمان اور ان کے ساتھ بہت سے وہ لوگ جو ان کی جان ومال یا ان کے دین وایمان کے اندرونی دشمن ہیں، ایک جگہ

اکٹھے ہوگئے ہیں، اور یہ موخرالذکر ہوشیار لوگ ابھی سے ایسی موقع کی جگہوں پر قبضہ کر رہے ہیں کہ سیلاب اترنے کے بعد جب معاملہ کی بات شروع ہو تو عام مسلمانوں کی رگ گلو ان کے ہاتھ میں رہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ مسلم لیگ نے کوئی بڑی ہی زبردست فضا پیدا کر دی ہے جس امیدوں کی ایک دنیا بستی نظر آتی ہے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ لیگ کی قیادت جس کے سامنے کانگریس سے لڑنے کے سلبی مقصد کے سوا کوئی ایجابی اسکیم نہیں ہے، اپنی نااہلی کی وجہ سے مسلمانوں میں سے اُن بدترین عناصر کو ابھار ابھار کر سطح پر لا رہی ہے جو اس سے پہلے مسلمانوں کی قومی زندگی کے کسی تاریک ترین دور میں بھی کم از کم سرداری و سربراہی کے مقام پر نہیں آسکتے تھے۔ فی الواقع اس رہنمائی کے سامنے آدمی کا کوئی معیار سرے سے ہے ہی نہیں۔ ہر وہ شخص جو اٹھ کر لیگ کی حمایت کی آواز اٹھا دے، پلیٹ فارم پر پہنچ جاتا ہے اور اعتماد کا پروانہ حاصل کر لیتا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمانوں کے لیے کتنا ہی مہلک ثابت ہونے والا ہو۔ سب سے زیادہ افسوسناک معاملہ جس نے لیگ کی موجودہ رہنمائی کا انتہائی نااہل ہونا واضح کر دیا ہے، اشتراکیوں کا معاملہ ہے۔ اس گروہ کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی وفاداریاں اور ہمدردیاں روس کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کی رہنمائی کی باگیں تک روس کے ہاتھ میں ہیں۔ کوئی قوم جو اپنے گھر میں آزاد ہونا یا رہنا چاہتی ہو، اپنے درمیان ایسے ایک گروہ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دے سکتی جو کسی بیرونی طاقت کے اشاروں پر کام کرتا ہو۔ اسی وجہ سے کانگریس نے اس گروہ کو اپنے اندر سے نکال باہر کیا اور ہندوؤں میں اس کے اثرات پھیلنے کا دروازہ تقریباً بند کر دیا۔ لیکن لیگ جس نے اپنے قابل اعتماد کا رکن بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور جو اس وقت اندھوں کی طرح ہر اس شخص یا گروہ کا سہارا لے رہی ہے جو بس اس کا الیکشن پروپگنڈا کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے، ان اشتراکیوں کو بے تکلف اپنے اندر لے آئی[1]، اور اس کو کچھ نہیں سوجھا کہ اپنے پاکستان میں وہ ایک ایسی طاقت کے ایجنٹوں

---

[1] اس سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی قابل توجہ ہے کہ لیگ کا دستور اساسی کمیونسٹوں کے داخلہ میں کسی طرح مانع نہیں ہے۔ چونکہ مسلم لیگ بلا اسلام بنائی گئی ہے اس لیے اس میں داخل ہونے کے لیے اسلام پر اعتقاد اور اس کی پیروی شرط نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جس کا نام مسلمانوں کا سا ہو اس میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ خدا اور آخرت اور رسالت کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔

کو قدم جمانے کا موقع دے رہی ہے جو ایران پر اپنا تسلط قریب قریب مضبوط کر چکی ہے اور اب اس کے اور پاکستان کے درمیان صرف افغانستان کی بودی سی دیوار حائل ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کم نظر قیادت کو یہ کھلے ہوئے آثار غداری بھی نظر نہیں آتے کہ کمیونسٹ جو ہندوستان میں بڑے مسلمان قوم پرست بنے ہوئے ہیں، ایران اور ٹرکی پر روس کی دست درازیوں کے خلاف ایک حرف نہیں کہتے بلکہ الٹا روس کو حق بجانب اور ایران و ٹرکی کو قابل الزام ٹھیرا رہے ہیں۔ کیا اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ کل اگر یہی روس پاکستان میں دخل اندازی شروع کرے گا تو ان کا رویہ کیا ہوگا؟

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اسلام اور اس کے مقاصد سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کیجیے کہ اس کے لحاظ سے تو لیگ کی تحریک مسلمانوں کو کوسوں دور لیے جا رہی ہے، لیکن محض قومی مفاد کو بھی اگر سامنے رکھا جائے تو مجھے وہ فضا کہیں نظر نہیں آتی جس کے متعلق خبر دی جا رہی ہے کہ وہ بڑی ہی کوئی سازگار فضا ہے۔ ایک طرف روس کا پانچواں کالم کمیونسٹ مسلمانوں پر مسلط کیا جا رہا ہے، دوسری طرف علما اور پیروں میں سے ان لوگوں کو ابھار کر سطح پر لایا جا رہا ہے جو ہمیشہ ہر اصلاح کے دشمن رہے ہیں، تیسری طرف ان خود غرض لوگوں کی ایک بڑی ٹولی برسر اقتدار آ رہی ہے جو مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر اپنے شخصی یا طبقاتی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جو کبھی اس قابل نہ تھے کہ ان پر ذرہ برابر اعتماد کیا جا سکتا، اور ان سب کے ساتھ سیدھے سادے عام مسلمانوں کا ایک انبوہ بھی ہے جو نہ فی الواقع منظم ہے، نہ صحیح اور غلط کا پورا شعور رکھتا ہے اور محض اس امید پر ان گروہوں کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا ہے کہ آخر کار اسی راستے پر کہیں نہ کہیں اسلامی منزل مقصود بھی مل جائیگی۔ یہ مختلف عناصر آج کانگریس کے مقابلہ میں متحد و متفق ہو سکتے ہیں، لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ کل یہ سب مل کر کوئی ایک تعمیری اسکیم بنا سکیں اور اسے ٹھیک ٹھیک چلا لے جائیں۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ لیگ پر تنقید کروں، کیونکہ کسی خاص گروہ کو ہدف بنانا اور اس کے خلاف معرکہ آرائی کرنا میرے پیش نظر نہیں ہے۔ مسلمان اس وقت ان مختلف سیاسی جماعتوں کے پیچھے جا رہے ہیں ان پر تنقید کرنے کے بجائے میں اس وقت زیادہ مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ خاموشی کے ساتھ اپنا تعمیری کام کرتا رہوں اور مسلمانوں کو ان تحریکوں کے نتائج دیکھ لینے دوں۔ لیکن اگر کوئی شخص خود نہ بولنا چاہے تو ان تحریکوں کے حامی اس کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ضرور بولے اور جب وہ اپنی صاف صاف رائے کا اظہار کرتا ہے تو پھر شکایتیں کرتے ہیں کہ تم ہمارے خلاف پروپگنڈا کرتے ہو۔

رسائل و مسائل

بندوق کے شکار کی حلت و حرمت

سوال: آپ نے تفہیم القرآن میں تکبیر پڑھ کر چھوڑی ہوئی بندوق کے مرے ہوئے شکار کو حلال لکھ کر ایک نئی بات کا اختراع کیا ہے جس پر مندرجہ ذیل سوالات اٹھ رہے ہیں مہربانی فرما کر جواب دے کر مشکور فرما دیں

۱۔ چاروں امام متفق ہیں کہ بندوق سے مرا ہوا شکار بوجہ چوٹ سے مرنے کے ناجائز اور حرام ہے پھر آپ نے کن دلائل کی بنا پر اس کو جائز لکھا ہے۔

۲۔ بندوق کی گولی میں دھار نہیں ہوتی بلکہ اس کی ضرب شدید سے جانور مرتا ہے۔ کارتوس پر عام طور پر لکھا ہوتا ہے کہ اس کی طاقت اتنے پونڈ ہے، یہ نہیں ہوتا کہ اس کی دھار اتنی تیز ہے ضرب سے مرا ہوا شکار قطعی ناجائز ہے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔

۳۔ تفسیر حقانی میں لکھا ہے کہ قاضی شوکانی نے بندوق کے مارے ہوئے کے حرام ہونے میں اختلاف کیا ہے لیکن قاضی صاحب کا اختلاف حجت نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مجروح احادیث بیان کرنے والا ہونے کے علاوہ اہل تشیع کی طرف میلان رکھتا ہے۔

۴۔ اس مسئلہ کو فروع کہنا عوام کو دھوکا دینا ہے۔ کیا حرام کو حلال کرنا بھی فروع ہی رہے گا۔

جواب: سب سے پہلے میں آپ کی اُس غلط فہمی کو دور کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو آپ کے سوال نمبر ۴ میں پائی جاتی ہے۔ آپ پوچھتے ہیں "کیا حرام کو حلال کرنا بھی فروع ہی رہے گا" اس سلسلہ میں آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک حرام و حلال تو وہ ہے جو نص صریح میں حلال یا حرام قرار دیا گیا ہو، اور وہ اصولی چیز ہے جس میں رد و بدل کرنا موجب کفر ہو جاتا ہے، دوسرا حلال و حرام وہ ہے جو نصوص

کی دلالتوں یا اشارات یا اقتضاآت سے استنباط کیا جائے، یہ فروعی چیز ہے اور اس میں ہمیشہ سے علماء و فقہائے امت حتیٰ کہ صحابہ اور تابعین کے درمیان بھی اختلافات رہے ہیں۔ ایک ہی چیز کو کسی نے حلال قرار دیا ہے اور کسی نے حرام، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نوع کی استنباطی تحلیل و تحریم پر مباحثہ و محاجہ سے آگے بڑھ کر کسی نے دوسرے کو یہ الزام دیا ہو کہ تمہارا دین بدل گیا ہے یا تم خدا کے حرام کیے ہوئے کو حلال کر رہے ہو۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان میں بلکہ عام مسلمانوں میں ایک مدت سے شرعی مسائل کی آزادانہ تحقیق کا سلسلہ بند ہے اور ہر گروہ کسی ایک مذہب فقہی کی پابندی میں اس قدر جامد ہو گیا ہے کہ اپنے ہی مذہب خاص کو اصل شریعت سمجھنے لگا ہے، اس لیے جب لوگوں کے سامنے ان کے مانوس مسلک سے ہٹ کر کوئی تحقیق آتی ہے تو وہ اس پر اس طرح ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ گویا دین میں کوئی تحریف کی گئی ہے، حالانکہ سلف میں جبکہ آزادانہ تحقیق کا دروازہ کھلا ہوا تھا علماء کے درمیان حلال و حرام اور فرض و غیر فرض تک کے اختلافات ہو جاتے تھے اور ان کو نہ صرف برداشت کیا جاتا تھا بلکہ ہر گروہ اپنے نزدیک جو حکم شرعی سمجھتا تھا اس کی خود پابندی کرنے کے ساتھ دوسروں کو بھی یہ حق دیتا تھا کہ ان کے نزدیک جو حکم شرعی ہو اس کی وہ پابندی کریں۔

اسی کھانے پینے کے مسئلہ میں علماء سلف کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں ان کی چند مثالیں میں یہاں نقل کرتا ہوں اور آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ ان حضرات میں سے کس کو آپ حرام کے حلال یا حلال کے حرام کر دینے کا الزام دے سکتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ وہ درندوں کے گوشت اور اس خون کے استعمال میں جو رگوں کے اوپر کے حصہ میں رہ جاتا ہے، مضائقہ نہیں سمجھتی تھیں اور ان کا استدلال اس آیت سے تھا کہ قُل لَّا أَجِدُ فِيمَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ "الآیۃ" اور اسی آیت کی بنا پر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بھی ان چار چیزوں کے سوا جن کو قرآن مجید میں حرام کیا گیا ہے (یعنی سؤر، مردار، بہتا ہوا خون اور مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ) اور کسی چیز کو حرام نہیں سمجھتے تھے۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص جلد سوم ص۲۰)

پالتو گدھے کے گوشت کے متعلق ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر بعض خاص وجوہ سے اس کے کھانے سے منع کیا تھا اور یہ ممانعت اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ گدھے کا

گوشت مطلقاً حرام ہے۔ (ایضاً ص۲۱)

درندوں اور شکاری پرندوں کے معاملہ میں امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب مطلق حرمت کے قائل ہیں۔ امام مالک درندوں کو حرام سمجھتے ہیں مگر شکاری پرندوں مثلاً کرگس، عقاب، گدھ وغیرہ کو حلال قرار دیتے ہیں، خواہ وہ مردار کھانے والے ہوں یا نہیں۔ امام اوزاعی صرف گدھ کو مکروہ سمجھتے ہیں، باقی ہر قسم کے پرندے ان کے ہاں حلال ہیں۔ لیث بلّی کو حلال سمجھتے ہیں اور بجّو کو مکروہ۔ امام شافعی کے نزدیک صرف وہ درندے جو انسان پر حملہ کرتے ہیں، یا وہ شکاری پرندے جو انسان کے پالتو جانوروں پر حملہ کرتے ہیں حرام ہیں، بجّو اور لومڑی اس تعریف میں نہیں آتے۔ عکرمہ سے کوّے کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ "موٹی مرغی ہے" اور بجّو کے متعلق پوچھا گیا تو کہا کہ "موٹی دنبی ہے"۔ (ایضاً ص۲۲)

اسی طرح حشرات الارض کے بارے میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ حنفیہ تمام حشرات الارض کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ سانپ کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ اس کے ساتھ ذکات (ذبح) کی شرط لگاتے ہیں۔ یہی رائے امام مالک کی بھی ہے، اور امام اوزاعی ذکات کی شرط کو بھی اڑا دیتے ہیں۔ لیث کے نزدیک خارپشت جائز ہے۔ امام مالک کے نزدیک مینڈک جائز ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ جن چیزوں سے اہل عرب گھن کھاتے تھے بس وہی خبائث ہیں چنانچہ اہل عرب بجو اور لومڑی کھاتے تھے اس لیے یہ دونوں حلال ہیں۔ (ایضاً ص۲۲)

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں نص صریح موجود نہ ہو وہاں استنباط کی بنا پر حلال و حرام کے اختلافات سب فروعی اختلافات ہیں، کسی مسلک فقہی میں بر بنائے اجتہاد کسی چیز کا حرام ہونا ہرگز یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ اصل شریعت الٰہی میں حرام ہے، اور اگر کوئی شخص ایسی کسی چیز کو اپنے استنباط کی بنا پر حلال قرار دے تو اس پر بحث تو ضرور کی جا سکتی ہے لیکن یہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے کہ اس پر رونگٹے کھڑے ہونے لگیں اور تحریف دین یا تحلیل مَا حَرَّمَ اللہ کے الزامات عائد کیے جانے لگیں۔

اب میں اس اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس پر آپ نے یہ سوالات کیے ہیں۔

مجھے حیرت ہے کہ یہ بات آپ نے کہاں سے معلوم کر کے لکھی کہ بندوق سے مرے ہوئے شکار کے

حرام ہونے پر چاروں امام متفق ہیں۔ کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی کے زمانہ میں بندوق ایجاد ہوگئی تھی؟ ائمہ اربعہ کے منقولہ مسلک میں سے کسی گروہ کا یا سب کا ان کے استنباطی مسائل میں سے کسی مسئلہ سے تخریج کرتے ہوئے کوئی حکم نکالنا اور چیز ہے اور خود ائمہ کا کوئی حکم بیان کرنا اور چیز۔ بندوق بہرحال فقہائے متاخرین کے زمانہ میں ایجاد ہوئی تھی اور اس کی ساخت میں تازہ ترین اصولی تغیر تو انیسویں صدی میں ہوا ہے۔ اس کے متعلق اگر کوئی حکم فقہا نے بیان کیا بھی ہے تو وہ ائمہ سلف کے اجتہادی احکام سے تفریع در تفریع کرتے ہوئے ہی بیان کیا ہوگا، اس پر آخر خواہ مخواہ یہ دعویٰ کیوں کیا جاتا ہے کہ اس چیز کی حرمت پر ائمہ اربعہ متفق ہیں۔

میں نے بندوق کے شکار کے حلال ہونے کا مسئلہ جو بیان کیا ہے وہ قاضی شوکانی سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ براہ راست کتاب و سنت سے اخذ کیا ہوا ہے۔ شریعت میں جانوروں کی ذکات (یعنی شرعی طریقہ سے ان کے ذبح) کے جو احکام ہیں ان کو اصولاً دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک قسم کے جانور وہ جو ہمارے قابو میں ہوں اور جن کو ہم مقرر طریقہ کے مطابق ذبح کر سکتے ہوں۔ ان کی شرط ذکات اور ہے اور اسے اصطلاحاً ذکات اختیاری کہا جا سکتا ہے۔ دوسری قسم کے جانور وہ ہیں جو ہمارے قابو میں نہ ہوں، مثلاً جنگلی جانور، یا وہ اہلی جانور جو بھاگ نکلا ہو اور وحشی کے حکم میں آگیا ہو، یا وہ جانور کہیں گر پڑا ہو اور جس کی شرط ذکات مقرر طریقہ پر ادا نہ کی جا سکتی ہو، یا وہ جانور جو کسی زخم سے مرنے کے قریب ہو اور ذبح کے لیے چھری تلاش کرتے کرتے اس کے مرجانے کا امکان ہو۔ ایسے تمام جانوروں کی شرط ذکات دوسری ہے اور اسے اصطلاحاً ہم ذکات اضطراری کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم کے جانوروں کا مقام ذبح حلق ہے اور ان کو ذبح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی تیز دھار والے آلے سے ان کے حلقوم کو اس حد تک کاٹا جائے کہ نرخرہ اور رگِ گلو کھل جائے۔ رہے دوسری قسم کے جانور تو ان کا سارا جسم مقام ذبح ہے، اور کسی چیز سے، خواہ وہ کوئی ہو، ان کے جسم میں اتنا خرق (Puncture) کر دینا کافی ہے کہ خون بہہ جائے۔ اس سلسلہ میں جو نصوص کتاب و سنت سے ہمیں ملتی ہیں وہ ترتیب وار درج ذیل ہیں:

(۱) أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ — حلال کر دی گئیں تمھارے لیے ساری پاک چیزیں اور جن

مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ (مائدہ)

شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو، جن کو تم خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو، وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو تم کھالو اور اس پر اللہ

اس سے معلوم ہوا کہ سدھائے ہوئے شکاری جانور کو اگر خدا کا نام لے کر چھوڑا گیا ہو تو اس کے پنجوں اور کچلیوں سے جو زخم وحشی جانور کو لگ جاتا ہے اور جو خون اس طرح نکل جاتا ہے اس سے "اضطراری ذکات" کی شرط پوری ہو جاتی ہے اور اگر ایسا جانور زندہ نہ ملے اور اسے باقاعدہ ذبح نہ کیا جاسکا ہو تب بھی وہ حلال ہے۔

(۲) حضرت عدی ابن حاتم نے نبی صلعم سے پوچھا کہ ہم معراض پھینک کر شکار کرتے ہیں، حضور نے جواب دیا "کل ما خزق وما اصاب بعرضہ فقتل فانہ وقیذ فلا تاکلہ" (متفق علیہ) یعنی اگر وہ چھید دے تو کھالو لیکن اگر معراض اپنے عرض کی طرف سے جانور کو لگی ہو اور اس سے وہ مر گیا ہو تو وہ چوٹ کھایا ہوا جانور (موقوذہ) ہے، اسے نہ کھاؤ۔

معراض ایک بھاری لکڑی یا عصا کو کہتے ہیں جس کے سرے پر یا تو لوہے کی انی لگی ہوئی ہو یا ویسے ہی لکڑی کو نوکدار بنا دیا گیا ہو۔ اس کی چوٹ سے جسم کے کسی حصہ کا اس حد تک پھٹ جانا یا چھد جانا کہ اس سے خون بہ جائے، شرط ذکات پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۳) رافع ابن خدیج کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کل دشمن سے ہمارا مقابلہ ہے اور ہمارے ساتھ چھریاں نہیں ہیں کہ ہم جانوروں کو ذبح کرسکیں، تو کیا ہم پھٹے ہوئے بانس کی کھپچی سے ذبح کرسکتے ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا "ما انہر الدم وذکر اسم اللہ فکل، لیست السن والظفر" (متفق علیہ) یعنی خدا کا نام لے کر جس چیز سے بھی خون بہا دیا جائے، ایسے جانور کو کھالو، البتہ دانتوں اور ناخنوں سے یہ کام نہ لیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز وہ آلہ نہیں ہے جس سے کام لیا جا رہا ہو، بلکہ شرط ذکات پوری کرنے میں صرف یہ بات معتبر ہے کہ خون بہا دیا جائے۔ اسی کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ حضرت عدی ابن حاتم نے پوچھا "یا رسول اللہ! اگر ہم میں سے کسی شخص کو شکار مل جائے اور اس کے پاس چھری نہ ہو تو کیا وہ پتھر کی

دھار یا پھٹی ہوئی لکڑی سے ذبح کر سکتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا "امرر الدم بما شئت واذکر اسم اللہ" یعنی خون بہا دو جس چیز سے چاہو اور اللہ کا نام لو!

(۴) ابو العُشَراء اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا ذبح کا مقام صرف حلق اور لبہ ہی نہیں ہے؟" آپ نے فرمایا "لو طعنت فی فخذھا لاجزأ عنک" (ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی) یعنی اگر تو اس کی ران میں بھی چبھو دے تو کافی ہے۔ ابو داؤد کہتے ہیں کہ یہ ایسے جانور کی ذکات ہے جو کسی گڑھے وغیرہ میں گر گیا ہو، ترمذی کہتے ہیں تمام ضروریات کے موقعوں کے لیے یہی ذکات ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جو جانور ہمارے قابو میں نہیں ہے اس کے جسم کا ہر حصہ مقام ذبح ہے نیز یہ کہ اصل شے وہ آلہ نہیں ہے جس سے کام لیا جائے، بلکہ صرف جسم کو چھید دینا ہے تاکہ خون بہ جائے۔

(۵) کعب بن مالک کہتے ہیں کہ ہماری بکریاں مقام سلع میں چر رہی تھیں۔ یکایک ہماری لونڈی نے دیکھا کہ ایک بکری مرنے کے قریب ہے۔ اس نے فوراً ایک پتھر توڑا اور اسے ذبح کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے کی اجازت دی (بخاری)۔ عطا ابن یسار کہتے ہیں کہ بنی حارثہ میں سے ایک شخص احد کے قریب گھاٹی میں ایک اونٹنی چرا رہا تھا۔ یکایک اس نے دیکھا کہ اونٹنی مر رہی ہے۔ مگر اسے کوئی چیز ایسی نہیں ملی جس سے وہ ذبح کر سکتا۔ آخر اس نے خیمہ گاڑنے کی ایک میخ لی اور اسے اونٹنی کے لبلبے میں چبھو دیا، یہاں تک کہ اس کا خون بہہ گیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی اور آپ نے اسے کھا لینے کی اجازت دے دی۔ (ابو داؤد، مؤطا)

ٹوٹے ہوئے پتھر کی دھار تو پھر بھی دھار کی تعریف میں آتی ہے لیکن لکڑی کی نوکدار میخ کو دھاردار آلے کی تعریف میں جس حد تک لایا جا سکتا ہے، ظاہر ہے۔

مذکورۂ بالا نصوص کو سامنے رکھنے کے بعد بندوق کے مسئلہ پر غور کیجیے۔ بندوق کی گولی کو غلیل کے ٹھنڈے غُلّے پر قیاس کرنا اور اس کی بنا پر یہ سمجھنا کہ اس سے جو جانور مرتا ہے وہ در اصل اسی طرح کی چوٹ کھا کر مرتا ہے جیسی پتھر یا لکڑی کے عرض سے لگتی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اگر گولی جس قوت سے بندوق سے نکلتی

ہے اور پھر جس تیز رفتار کے ساتھ وہ بندوق سے نشانہ تک (تقریباً ۵۰۰ گز فی سکنڈ) راستہ طے کرتی ہے اس کی بنا پر وہ کوئی ٹھنڈا سنگریزہ نہیں رہتی، بلکہ اچھی خاصی نرم اور تقریباً نوکدار ہو کر جسم کو چھیدتی ہوئی اس میں گھستی ہے اور پھر اس سے خون بہ کر جانور مرتا ہے۔ یہ عمل شکاری جانور کے ناخنوں اور کچلیوں اور معراض یا لکڑی کی میخ کا سرا چبھنے سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتا، بلکہ خون بہانے میں بعید نہیں کہ ان سے زیادہ ہی کارگر ہو۔

ان وجوہ سے میری رائے میں اگر خدا کا نام لے کر بندوق چلائی جائے اور اس کی گولی یا چھرے سے جانور مر جائے تو اس کے حلال نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا اس پر اطمینان نہ ہوا ور وہ اس کو حرام ہی سمجھتا ہو تو مجھے اس پر بھی اصرار نہیں ہے کہ وہ ضرور اسے حلال مانے اور واجب ہے کہ اسے کھائے۔ میرا اجتہاد میرے لیے قابل عمل ہے اور دوسروں کا اجتہاد یا کسی مجتہد کا اتباع ان کے لیے۔ اس اجتہادی اختلاف سے اگرچہ میرے اور ان کے درمیان حرام و حلال کا اختلاف ہو جاتا ہے، مگر اس کے باوجود دونوں فریق ایک ہی دین میں رہتے ہیں، الگ الگ دینوں کے پیرو نہیں ہو جاتے۔

تحقیق حدیث دجّال

سوال:۔ ترجمان القرآن جلد ۲۷، عدد ۳،۴ میں ایک سوال تھا کہ "کانے دجال کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقید ہے، تو آخر وہ کونسی جگہ ہے؟ آج دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے، پھر کیوں کانے دجال کا پتہ نہیں چلتا؟" اس کا جواب آپ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ "کانا دجال وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے"۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے کم از کم تیس روایات میں دجال کا تذکرہ موجود ہے جس کی تصدیق بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، شرح السنہ، بیہقی کے ملاحظہ سے کی جا سکتی ہے۔ پھر آپ کا جواب کس سند پر مبنی ہے۔

جواب:۔ میں نے جس چیز کو افسانہ قرار دیا ہے وہ یہ خیال ہے کہ دجّال کہیں مقید ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ ایک بڑا فتنہ پرداز (الدجال) ظاہر ہونے والا ہے، تو اس کے متعلق احادیث میں جو خبر دی گئی ہے،

میں اُس کا قائل ہوں اور ہمیشہ اپنی نماز میں وہ دعائے ماثورہ پڑھا کرتا ہوں جس میں منجملہ دوسرے تعوذات کے ایک یہ بھی ہے کہ اعوذ بک من فتنۃ المسیح الدجال۔

دجال کے متعلق جتنی احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں ان کے مضمون پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کو اللہ کی طرف سے اِس معاملہ میں جو علم ملا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجال ظاہر ہونے والا ہے، اس کی یہ اور یہ صفات ہوں گی، اور وہ ان ان خصوصیات کا حامل ہوگا۔ لیکن یہ آپ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا، کہاں ظاہر ہوگا، اور یہ کہ آیا وہ آپؐ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپؐ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے۔ ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں وہ دراصل آپؐ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے۔ کبھی آپ نے یہ ظاہر فرمایا کہ دجال خراسان سے اٹھے گا، کبھی یہ کہ اصفہان سے، اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے۔ پھر کبھی آپ نے ابن صیاد نامی ایک یہودی بچے پر جو مدینے میں (غالباً سنہ ۲ ہجری میں) پیدا ہوا تھا شبہ کیا کہ شاید یہی دجال ہو۔ اور آخری روایت یہ ہے کہ ۹ھ میں جب فلسطین کے ایک عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا اور آپ کو یہ قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ سمندر میں (غالباً بحر روم یا بحر عرب میں) سفر کرتے ہوئے ایک غیر آباد جزیرے میں پہنچے اور وہاں ان کی ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی اور اس نے انھیں بتایا کہ وہ خود ہی دجال ہے، تو آپ نے ان کے بیان کو کوئی غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہ سمجھی، البتہ اس پر اپنے شک کا اظہار فرمایا کہ اس بیان کی رو سے دجال بحر روم یا بحر عرب میں ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ مشرق سے ظاہر ہوگا۔

یہ تردد اول تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں، اور آپ کا گمان وہ چیز نہیں ہے جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپ کی نبوت پر کوئی حرف آتا ہو، یا جس پر ایمان لانے کے لیے ہم مکلف کیے گئے ہوں۔ پھر جبکہ بعد کے واقعات سے ان باتوں کی تردید بھی ہو چکی ہے جو اس سلسلہ میں آپ نے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ان کو عقائد میں داخل رکھنے پر اصرار کیا جائے۔ ابن صیاد پر آپ کو شبہ ہوا تھا کہ شاید وہی دجال ہو، اور حضرت عمرؓ نے تو قسم بھی کھائی تھی کہ یہی دجال ہے۔ مگر بعد میں وہ مسلمان ہوا، حرمین میں رہا، اسلام

میں مرا اور اس کی نمازِ جنازہ مسلمانوں نے پڑھی۔ اب اس کی کیا گنجائش باقی رہ گئی کہ آج تک ابنِ صیاد پر دجال ہونے کا شبہ کیا جاتا رہے؟ تمیم داری کے بیان کو حضور نے اس وقت تقریباً صحیح سمجھا تھا، مگر کیا ساڑھے تیرہ سو برس تک بھی اس شخص کا ظاہر نہ ہونا جسے حضرت تمیم نے جزیرے میں محبوس دیکھا تھا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس نے اپنے دجال ہونے کی جو خبر حضرت تمیم کو دی تھی وہ صحیح نہ تھی؟ حضور کو اپنے زمانہ میں یہ اندیشہ تھا کہ شائد دجال آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے یا آپ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں ظاہر ہو، لیکن کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ حضور کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا؟ اب ان چیزوں کو اس طرح نقل و روایت کیے جانا کہ گویا یہ بھی اسلامی عقائد ہیں، نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی ہے اور نہ اسے حدیث ہی کا صحیح فہم کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اس قسم کے معاملات میں نبی کے قیاس و گمان کا درست نہ نکلنا ہرگز منصبِ نبوت پر طعن کا موجب نہیں ہے، نہ اس سے عصمتِ انبیاء کے عقیدے پر کوئی حرف آتا ہے، اور نہ ایسی چیزوں پر ایمان لانے کے لیے شریعت نے ہم کو مکلف کیا ہے۔ اس اصولی حقیقت کو تابیرِ نخل والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود واضح فرما چکے ہیں۔

دو شبہات

سوال: میں نے پورے اخلاص و دیانت کے ساتھ آپ کی دعوت کا مطالعہ کیا ہے جس کے نتیجہ میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ اصولاً صرف جماعتِ اسلامی ہی کا مسلک صحیح ہے۔ آپ کے نظریہ کو قبول کرنا اور دوسروں میں پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس دور میں ایمان کو سلامتی کے ساتھ لے چلنے کے لیے صرف جماعتِ اسلامی ہی کی راہ اختیار کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ میں ان دنوں اپنے آپ کو اس جماعت کے حوالے کر دینے پر تُل گیا تھا، مگر ترجمان میں ایک دو چیزیں ایسی نظر سے گذریں کہ مزید غور و تامل کا فیصلہ کرنا پڑا۔ میں نکتہ چیں اور معترض نہیں ہوں، بلکہ حیران و سرگرداں مسافر کی حیثیت میں، جسے اپنی منزلِ مقصود کی محبت چین نہیں لینے دیتی، آپ سے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مشارٌ الیہ مسائل کے متعلق میری گذارشات پر غور فرمایئے۔

(۱) آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:-

"مجرد حدیث پر ایسی کسی چیز کی بنا نہیں رکھی جا سکتی جسے مدارِ کفر و ایمان قرار دیا جائے۔
احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز
حاصل ہوتی ہے تو وہ محض گمانِ صحت ہے، نہ کہ علم الیقین۔"

یہ عقیدہ جہاں تک بندہ کا خیال ہے، محدثین کے بالکل خلاف ہے۔ کتبِ اصول میں بصراحت موجود ہے کہ جس طرح قرآن مجید مسلمانوں کے لیے قانونی کتاب ہے، اسی طرح حدیث! اور جس طرح قرآن مجید کے احکام، چاہے اصولی ہوں، چاہے فروعی، ہمارے لیے حجت ہیں، اسی طرح احادیث بھی حجت ہیں۔ آپ کے طرزِ تحریر سے کسی حد تک حدیث سے بے توجہی معلوم ہوتی ہے۔

(۲) داڑھی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ایسی موجود ہیں جن میں آپ نے داڑھی بڑھانے کا حکم فرمایا ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ داڑھی کو مطلقاً بڑھایا جائے۔ آپ کترنے کی گنجائش نکالنا چاہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ابن عمرؓ کی روایت کے بموجب ایک مشت تک کٹوا دیں۔ اس سے زیادہ کم کرنے کی گنجائش نکلتی نظر نہیں آتی۔ باقی جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ صحابہ و تابعین کے حالات میں ان کی داڑھیوں کی مقدار کا ذکر کہیں شاذ و نادر ہی ملتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سلف میں یہ مسئلہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا جو اسے دے دی گئی ہے۔ تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ اصل میں قرونِ ماضیہ میں لوگ اس سنت کے اس قدر پابند تھے کہ اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج سے چند سال پہلے عام مسلمان داڑھی کو صرف منڈوانے بلکہ کتروانے تک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پس اس چیز کی وقعت اور قدر لوگوں کے دلوں سے کم نہ کیجیے بلکہ بحال رہنے دیجیے۔

ان دونوں شکوک پر اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیے۔"

جواب:- آپ کے شبہات کا جواب بالاختصار دے رہا ہوں۔ غالباً یہ چند سطور اطمینان کے لیے کافی ہوں گی۔

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو میں بھی قرآن کی طرح حجت مانتا ہوں اور میرے نزدیک جو

عقیدہ آپ نے بیان کیا ہو یا جو حکم آپ نے ارشاد فرمایا ہو، وہ اسی طرح ایمان و اطاعت کا مستحق ہے جس طرح کوئی ایسا عقیدہ یا حکم جو قرآن میں آیا ہو، لیکن قول رسول، اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیات قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ آیات قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے، بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضور کا ہے یا نہیں۔ جو سنتیں تواتر کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک منتقل ہوئی ہیں یا جو روایات محدثین کی مسلمہ شرائط تواتر پر پوری اترتی ہیں وہ یقیناً ناقابل انکار حجت ہیں۔ لیکن غیر متواتر روایات سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے اصول میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ غیر متواتر روایات احکام کی ماخذ تو ہو سکتی ہیں لیکن ایمانیات کی ماخذ نہیں ہو سکتیں۔

(۲) جو باتیں آپ نے ڈاڑھی کے متعلق تحریر فرمائی ہیں ان پر میں اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں اور اب خواہ مخواہ ایک ہی بات کو سمجھے جاتے سے کچھ فائدہ نہیں۔ صاف بات ہے کہ اگر کسی فروعی مسئلے میں میرے دلائل سے آپ کا اطمینان ہو جائے تو بہتر ہے، اور اطمینان نہ ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں آپ اس معاملہ میں میری رائے کو غلط سمجھ کر رد کر دیں اور جو کچھ خود صحیح سمجھتے ہوں اس پر عمل کریں۔ اس قسم کے جزوی مسائل میں ہم مختلف رائیں رکھتے ہوئے بھی ایک ہی دین کے پیرو رہ سکتے ہیں اور اس دین کی اقامت کے لیے مل کر کام کر سکتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں جماعت میں شامل ہونے ہی والا تھا کہ یہ دو چیزیں میرے سامنے آگئیں اور انھیں دیکھ کر میں رک گیا۔ اس رک جانے کو آپ شاید کوئی تقویٰ کا فعل سمجھتے ہوں گے، لیکن آپ ذرا غور کریں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ فی الواقع آپ نے تقویٰ کا مفہوم غلط سمجھا ہے اور اسی وجہ سے ایک غیر متقیانہ فعل کو متقیانہ فعل سمجھ کر آپ گزرے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جماعت اسلامی جس چیز کی اقامت کے لیے اٹھی ہے وہ ہر مومن کے عین ایمان کا مقتضا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ اس دور میں ایمان کو سلامتی کے ساتھ لے چلنے کے لیے صرف جماعت اسلامی ہی کی راہ اختیار کی جا سکتی ہے اور یہ کہ اس نظریے کو قبول کرنا اور اسے پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تقاضائے ایمان اور اس فرض کی طرف بڑھتے بڑھتے

آپ کا صرف اس لیے رک جانا کہ ایک علمی مسئلہ کی تعبیر اور ایک جزوی فقہی مسئلے کی تحقیق میں آپ جماعت کے خادم کی رائے کو غلط پاتے ہیں، آخر کس قسم کا تقویٰ ہے؟ فقہی و علمی اختلاف تو خیر بہت چھوٹی چیز ہے کہ اس کے لیے فریقین کے پاس شریعت سے دلائل موجود ہوتے ہیں، میں ثابت شدہ سنتوں کے متعلق آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان کی خلاف ورزی دیکھ کر بھی اگر آپ فرض سے اجتناب کر جائیں تو کیا یہ پرہیزگاری ہے؟ مثلاً آپ دیکھیں کہ امام نے مسجد میں داخل ہوتے وقت بایاں قدم پہلے رکھا اور یہ دیکھتے ہی آپ جماعت چھوڑ کر مسجد سے پلٹ آئیں، یا آپ دیکھیں کہ اسلامی فوج کے جنرل نے الٹے ہاتھ سے پانی پیا یا چھینک آنے پر الحمد للہ نہ کہا اور اس خلاف سنت حرکت سے متنفر ہو کر آپ میدان جہاد سے پلٹ آئیں تو کیا واقعی اس کو آپ پرہیزگاری سمجھیں گے؟ آپ کو موازنہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ اس نے کیا چھوڑا تھا اور آپ نے کیا چھوڑ دیا۔ وہ بڑا غلط کار تھا کہ اس نے ایک پیسہ ضائع کیا، مگر آپ نے تو اس کے جواب میں خزانہ برباد کر دیا، پھر بتایئے کہ زیادہ بڑا غلط کار کون ہوا؟ تاہم یہ آپ کا قصور نہیں ہے بلکہ آج کل دینداری کا عام ڈھنگ یہی ہے کہ اشرفیاں لٹیں اور کوئلوں پر مُہر۔

(بقیہ صفحہ ۱۲) کو مخاطب کیا اور یہی طریقہ ان تمام حالات میں نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جبکہ کسی جزوی اصلاح کی جگہ کلی اصلاح کی ضرورت درپیش ہو۔ آج ہم اس ملک کے اندر اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ایک نظام حق قائم ہو اور اس کے اندر کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو اور ہمیں اس کی اصلاح کرنی ہو، بلکہ صورت حال یہ ہے کہ اس ملک سے نظام حق بالکل رخصت ہو چکا ہے اور ہمیں از سر نو اس کے قیام کی دعوت بلند کرنی ہے۔ اس مقصد کے لیے دعوت کی ترتیب صرف وہی صحیح اور مفید ہو سکتی ہے جس کی اوپر ہم نے تفصیل کی ہے۔ ہاں اگر یہاں ایک نظام حق برپا ہوتا اور اس کے کسی شعبے میں خرابی نمودار ہوتی تو صرف وہ شعبہ ہماری توجہ کا مستحق ہوتا لیکن جہاں دعوت عام کا سوال پیدا ہو چکا ہو وہاں لازم ہے کہ حضرات انبیائے کرام کے طریق پر دعوت عام بلند کی جائے اور اس دعوت میں سب سے پہلے اس ملک کے ذہین اور کارفرما عناصر کو خطاب کیا جائے۔ عام اس سے کہ وہ مسلمانوں کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں یا غیر مسلموں سے۔ یہ سوال کے پہلے جز کا جواب تھا۔ آئندہ ہم سوال کے دوسرے حصہ پر بحث کریں گے۔

جماعت اسلامی کا دوسرا اجتماع عام

کانپور کے بجائے الٰہ آباد

جماعت اسلامی کا یہ دوسرا اجتماع ۲، ۳، ۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ (مطابق ۵، ۶، ۷ اپریل ۱۹۴۶ء)

کو موضع ہروارہ، متصل شہر الٰہ آباد میں منعقد ہوگا۔

۱۔ ارکان جماعت کے لیے لازم ہے کہ اجتماع میں شریک ہوں الا یہ کہ کوئی عذر شرعی مانع ہو۔ اگر ممکن ہو تو عذر کی صورت میں اجتماع سے پہلے مرکز کو معذرت بھیجی جائے۔ ورنہ اجتماع کے بعد متصلاً عدم شرکت کے وجوہ بتائے جائیں (خواتین کے لیے شرکت اجتماع لازم نہیں ہے)

۲۔ شرکت کا ارادہ رکھنے والے ارکان اور ہمدردوں کو (اور جو خواتین آنا چاہیں ان کو بھی) اپنے ارادے کی اطلاع ۲۰ مارچ ۱۹۴۶ء تک حکیم محمد خالد صاحب (موضع ہروارہ۔ ڈاکخانہ بیگم سرائے ضلع الٰہ آباد) کو بھیج دینی چاہیے۔

۳۔ جو اصحاب اور خواتین لاہور سے جماعت کے قافلے میں شریک ہونا چاہیں وہ ۲۰ مارچ تک مرکز کو اپنے ارادے کی بھی اطلاع دیں اور کرایہ بھی جمع کرا دیں۔

۴۔ اجتماع میں پیش کرنے کے لیے رپورٹیں مرتب کرنے کے متعلق مفصل ہدایات اخبار "کوثر" لاہور میں مسلسل شائع ہو رہی ہیں ان کو ملحوظ رکھا جائے۔

۵۔ جو ارکان تجاویز پیش کرنا چاہیں یا جماعت کے نظم یا کام سے متعلق سوالات کرنا چاہیں وہ اپنی تجاویز اور سوالات ۲۰ مارچ تک مرکز میں بھیج دیں۔

۶۔ ارکان ۵ اپریل کی صبح تک اور ارکان مجلس شوریٰ ۴ اپریل کی شام تک الٰہ آباد پہنچ جائیں۔

نوٹ:- ہروارہ ریلوے اسٹیشن نہیں ہے۔ ٹکٹ الٰہ آباد کے لیے جائیں۔

خاکسار۔ طفیل محمد، قیم جماعت اسلامی، دارالاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)

"ناظرین ترجمان القرآن"

کے لئے

خوش خبری

"ترجمان القرآن" کے تمام ناظرین یہ خبر سن کر بہت خوش ہونگے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے ملتان جیل سے "تفہیم القرآن" کو نظر ثانی کے بعد مرتب کر کے بھیج دیا ہے۔ یہ کتاب فی الحال دو جلدوں میں ہوگی۔ پہلی جلد سورۃ الفاتحہ سے سورۃ المائدہ تک مع دیباچہ اور مقدمہ کے ہوگی اور دوسری جلد سورۃ الانعام سے سورۂ یوسف تک۔ تفہیم القرآن کا مسودہ شیخ قمر الدین صاحب، پبلشر، اندرون موچی دروازہ لاہور کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ جو اسے دیدہ زیب بنا کر شائع کریں گے۔

اس کے علاوہ مولانا محترم نے اپنی کتاب "سود" کو مکمل کرنے کے لئے کچھ مضامین ارسال فرمائے ہیں۔ جو ترجمان القرآن کی اس اشاعت سے شائع کرنے شروع کر دئے گئے ہیں۔ اور اس کے علاوہ "سود" میں بھی شامل کئے جائیں گے۔

مینیجر

ترجمان القرآن

۵- اے- ذیلدار پارک- اچھرہ

لاہور

سرورق مطبوعہ ریپن پریس، لاہور